نقار خانہ

محمد یوسف وسیر



شریف پبلشرز، اردو بازار لاہور

نقار خانہ

محمد یوسف وسیر

شریف پبلیشرز، اردو بازار لاہور

نام کتاب: نقار خانہ

مصنف: محمد یوسف وسیر

کمپوزنگ: محمد شہیر وسیر

پبلشر: مسطور پبلیکیشنز گوجرانوالہ

سن اشاعت: ۲۰۲۵ء

تعداد: ۱۱۰۰

انتساب

اپنے دادا جان حضرت مولانا محمد شریف وسیر کے نام

پیش لفظ

نقار خانہ ایک کتاب نہیں، ایک واردات ہے؛ ایک ایسا روحانی و جمالیاتی تجربہ جس میں صدا خاموشی سے مکالمہ کرتی ہے اور ساز انسان کے باطن کی کہانی سناتے ہیں۔ یہ وہ مکان ہے جہاں لکڑی، دھات، تار اور سانس محض مادی اجزا نہیں رہتے بلکہ انسانی صفات، نفسی کیفیتوں اور روحانی مدارج کی علامت بن کر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہاں ہر ساز ایک انسان ہے، اور ہر انسان ایک نغمہ — بس شرط یہ ہے کہ سننے والا سننے کا ہنر رکھتا ہو۔

اس کتاب میں موسیقی محض فن نہیں بلکہ ایک استعارہ ہے؛ اور نقار خانہ محض نمائش گاہ نہیں بلکہ حیاتِ انسانی کا آئینہ خانہ ہے۔ بانسری، جس کے سینے میں سوراخ ہیں، یہاں درویش صفت انسان کی علامت ہے — وہ انسان جو خالی ہونے سے بھر جاتا ہے، جو زخمی ہونے سے نغمہ بناتا ہے، اور جس کی خاموشی بھی معنی رکھتی ہے۔ بانسری کے سوراخ، نفس کے ان مدارج کی طرح ہیں جن سے گزر کر انسان صدا بنتا ہے: خواہش، ندامت، ضبط، صبر، رضا — اور آخر کار فنا فی الصوت۔

اسی خانے میں طبل ہے، جس کی گونج اعلان ہے؛ رباب ہے، جس کے تار یادوں کی طرح چھیڑنے پر لرز اٹھتے ہیں؛ ستار ہے، جو فاصلوں کے باوجود ہم آہنگی پیدا کرتا ہے؛ اور نقارہ ہے، جو اقتدار، غرور اور اجتماعی شعور کی علامت بن کر ابھرتا ہے۔ ہر ساز اپنی ساخت میں مختلف ہے، مگر سب کا مقدر ایک ہے: بجنا — اور بج کر سچ کہنا۔

نقار خانہ دراصل انسانوں کی ایک خاموش بستی ہے، جہاں کوئی چیختا نہیں، مگر سب کچھ کہہ دیا جاتا ہے۔ یہاں سازوں کی قطاریں، انسانی طبقات کی طرح سجی ہیں؛ کوئی نازک ہے، کوئی سخت؛ کوئی بلند آہنگ ہے، کوئی مدھم؛ کوئی تنہا بجتا ہے، کوئی ہم سازوں کے بغیر بے معنی ہے۔ یہ فرق، یہ تنوع — انسانی سماج کی وہی تصویر ہے جو روز ہماری آنکھوں کے

سامنے بکھری رہتی ہے، مگر ہم دیکھ نہیں پاتے۔

اس کتاب کی زبان شعوری طور پر احترام میں ڈوبی ہوئی ہے، کیونکہ یہ سازوں کا نہیں، انسان کے باطن کا ادب ہے۔ یہاں استعارہ محض آرائش نہیں بلکہ ذریعہ انکشاف ہے؛ تشبیہ محض حسن نہیں بلکہ فہم کی کنجی ہے اور علامت محض اشارہ نہیں بلکہ راستہ ہے۔ قاری جیسے جیسے اس نقار خانے میں آگے بڑھتا ہے ویسے ویسے وہ خود کو مختلف سازوں میں بکھرا ہوا پاتا ہے— کہیں وہ بانسری ہے کہیں نقارہ، کہیں ٹوٹا ہوا ساز جو ابھی بجنے کے انتظار میں ہے۔

آخر میں نقار خانہ اس یقین کے ساتھ قاری کے سپرد کیا جاتا ہے کہ اگر اس مکان میں قدم رکھتے ہی کوئی صدا دل کے اندر گونجے، کوئی خاموش ساز اپنا سا لگے، یا کوئی نغمہ آنکھوں کو نم کر دے— تو سمجھ لیجیے کہ یہ کتاب نہیں مترنم ہوئی، آپ کے دل کا ترنم جاگ اٹھا ہے۔ کیونکہ اصل موسیقی ساز میں نہیں، انسان میں ہوتی ہے۔

نقارخانہ

یہ اس ملک کا قصہ ہے جو نقشہ ارض پر کہیں ثبت نہ تھا، مگر وقت کے پردوں پر اس کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی تھیں۔ اس کی سرحدیں اینٹ اور پتھر سے نہیں، آہنگ اور خاموشی کے نازک امتزاج سے بنتی تھیں۔ اس ملک میں صبح ہوا کے نرم راگ سے طلوع ہوتی اور شام سنہری سکوت کی جھالر اوڑھ کر اترتی۔ یہ ایک عجیب مگر نہایت خوشحال سلطنت تھی۔

اس ملک کے شہر موتیوں کی لڑی کی مانند ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ گلیاں قوسِ قزح کی طرح رنگ بدلتی تھیں اور بازاروں میں سانسوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ کاریگر لوہے کو ہاتھ لگاتے تو وہ نرم پڑ جاتا، لکڑی سے بات کرتے تو وہ جھک کر اپنی رگیں دکھاتی، اور دھاتیں پگھلتے وقت چیختی نہیں تھیں بلکہ سسکیاں لے کر اپنی کہانیاں سناتی تھیں۔ یہاں کے لوگ جانتے تھے کہ ہر مادہ ایک مزاج رکھتا ہے، اور ہر مزاج کی ایک لے ہوتی ہے۔

رعایا کی زندگی میں ایک عجیب توازن تھا۔ کسان ہل چلاتے تو زمین سے آہنگ ابھرتا، عورتیں چرخہ کاتتیں تو دھاگے میں دعا کی تھرتھراہٹ شامل ہو جاتی، اور بچے کھیلتے ہوئے قہقہے نہیں لگاتے تھے بلکہ سر باندھتے تھے۔ کوئی بھوکا نہ تھا، مگر کوئی حد سے زیادہ سیر بھی نہ تھا؛ گویا قناعت اس ملک کی قومی غذا تھی۔ یہاں دولت تھی مگر نمائش نہیں، علم تھا مگر تکبر نہیں، اور عبادت تھی مگر ریا نہیں۔

اس سلطنت کا تاجدار — جسے لوگ صرف سازندہ اعظم کہہ کر پکارتے — قد و قامت میں بلند نہیں تھا، مگر اس کی خاموشی میں وزن تھا۔ اس کی آنکھوں میں وقت ٹھہرا ہوا تھا، اور اس کی پیشانی پر سوالوں کی جھریاں تھیں۔ وہ حکم دیتا تو حکم میں صلابت نہیں بلکہ ترتیب ہوتی؛ وہ مسکراتا تو مسکراہٹ میں فتح نہیں بلکہ فہم جھلکتا۔ اس کے دربار میں تلواریں نہیں، پیمانے رکھے ہوتے — پیمانے جن سے لفظوں کی مقدار اور نیتوں کا خلوص ناپا جاتا۔

کہا جاتا تھا کہ سازندہ اعظم نے جوانی میں ایک طویل خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اس خاموشی نے اسے وہ سننے کی صلاحیت عطا کی جو عام کانوں کو میسر نہیں۔ وہ انسان کے اندر بجنے والے ساز سن لیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہر آدمی کے

سینے میں ایک تال ہے، ہر نبض میں ایک ضرب، اور ہر آنکھ میں ایک سُر۔ اسی علم نے اسے عادل بنایا، اور اسی عادلانہ سماعت نے ملک کو خوشحال رکھا۔

ایک دن، جب خزاں کی دھوپ شہد کی طرح گاڑھی ہو چکی تھی، سازندہ اعظم نے دربار میں ایک حکم صادر کیا— یہ حکم نہیں تھا ایک خواب تھا۔ اس نے کہا: ایک نقار خانہ تعمیر کیا جائے؛ جہاں تمام ساز جمع ہوں، جہاں لکڑی، دھات، چمڑا اور سانس ایک دوسرے کو پہچانیں۔ یہاں ہر ساز اپنی پیدائش، اپنی مشقت، اور اپنی لے خود سنائے۔

درباری حیران تھے۔ کچھ نے اسے جشن سمجھا، کچھ نے اسے آزمائش۔ اس ملک میں خوابوں سے سوال نہیں کیے جاتے تھے؛ انہیں صرف جگہ دی جاتی تھی۔ سب نے حکم سنا اور دل و جان سے شاہ کے خواب کو پورا کرنے کے لیے پرعزم ہو گئے۔ کاریگروں نے اپنے اوزار دھوئے، معماروں نے نقشے نہیں بنائے بلکہ خوابوں کی پیائش کی۔ بنیاد رکھی گئی تو اینٹوں کے نیچے خاموش دعائیں دفن کی گئیں۔ دیواریں اٹھیں تو ان میں گونج کے خانے چھوڑے گئے، تاکہ آواز کہیں قید نہ ہو جائے۔

نقار خانہ شہر کے دل میں بنا— نہ بہت بلند، نہ بہت پست۔ اس کا گنبد آسمان کی نقل نہیں تھا بلکہ آسمان سے مکالمہ کرتا تھا۔ اس کے ستون انسانی قامت کے تھے، جیسے کوئی کہہ رہا ہو: "یہاں کھڑے ہو کر سنا جائے گا۔" فرش پر لکڑی بچھائی گئی جو قدموں کے بوجھ سے کراہتی نہیں تھی بلکہ قدموں کی کہانی محفوظ کرتی تھی۔

اس دوران ملک کی فضا بدلنے لگی۔ لوگ بات کم کرتے اور سننا زیادہ پسند کرنے لگے۔ بچوں نے شور مچانا چھوڑ کر تالیاں بجانا سیکھیں، اور بوڑھوں نے شکوہ ترک کر کے سازوں کے نام یاد کرنے شروع کیے۔ ہر شخص کو یوں لگتا جیسے وہ کسی بڑی محفل سے پہلے اپنی نشست تلاش کر رہا ہو۔

بادشاہ روزانہ شام کو تعمیر دیکھنے آتا۔ وہ ہاتھ دیوار پر رکھتا تو اینٹیں دھڑکنے لگتیں۔ وہ فرش پر چلتا تو لکڑی سُروں میں بدل جاتی۔ اس کی موجودگی میں وقت آہستہ چلتا، جیسے کسی مشکل راگ کی مشق ہو رہی ہو۔

آخر وہ دن آیا جب کام مکمل ہو گیا۔ دروازے کھلے تو ہوا نے اندر قدم رکھا اور پہلی لے بجی— ایسی لے جس میں وعدہ تھا۔ سازندہ اعظم داخل ہوا۔ اس کے پیچھے دربار نہیں، شہر چل رہا تھا۔ اس نے گردن اٹھا کر گنبد کو دیکھا، جیسے کسی پرانے دوست سے مل رہا ہو۔ پھر اس نے نگاہ دوڑائی اور سازوں کی قطاروں کو دیکھا— خاموش، مگر بیدار۔

اس نے مسکرا کر کہا: "آج میں تمہیں نہیں بجاؤں گا۔ آج تم خود بولو گے۔" اور پھر اس نے موسیقاروں کو بلانے کا

اشارہ کیا—وہ موسیقار جن کے ہاتھوں میں ریاضت کے چھالے تھے، جن کی انگلیوں میں سانس کی گرمی تھی اور آنکھوں میں اپنی اپنی کہانیاں۔

یوں نقّارخانہ محض ایک عمارت نہ رہا؛ وہ آئینہ بن گیا—ایسا آئینہ جس میں انسان اپنے اندر بجنے والے ساز کو دیکھ سکتا تھا۔ابھی قصہ شروع ہونا تھا، ابھی ہر ساز نے اپنی پیدائش، اپنی اذیت، اور اپنی لے سنانی تھی۔مگر اس لمحے، اس ملک نے پہلی بار اجتماعی طور پر سانس روکی—اس یقین کے ساتھ کہ جو سنا جائے گا، وہ صرف موسیقی نہیں ہوگی بلکہ انسان کی اپنی سرگزشت۔

بادشاہ، اس کے عاقل وزیر اور امرا نے نقارخانے کا دورہ شروع کیا مختلف قسم کے سازوں کی خاموش کہانیاں سننے لگے۔ نقّارخانے میں داخل ہوتے ہی جس شے پر نگاہ سب سے پہلے ٹھہرتی تھی، وہ نقّارہ تھا۔وہ کسی ساز کی طرح نہیں بلکہ کسی تخت کی طرح رکھا گیا تھا۔گویا باقی تمام ساز اس کے گرد یوں موجود ہوں جیسے دربار میں اہلِ مجلس، اور نقّارہ ان سب کے درمیان ایک خاموش مگر فیصلہ کن وجود۔اس کی جسامت بڑی تھی، دائرہ مکمل، اور کھال اس شدت سے تنی ہوئی تھی کہ یوں محسوس ہوتا جیسے ذراسی غفلت پورے نظام کو لرزادے گی۔

نقّارہ محض ایک آلہ موسیقی نہ تھا؛ وہ ایک مزاج تھا، ایک اعلان، ایک دھڑکتا ہوا سینہ۔اس کا پیٹ گہرا اور تاریک تھا، جیسے کسی کا باطن جس میں روشنی کم اور ذمہ داری زیادہ ہو۔وہ جو ہنستا کم ہے، مسکراتا بھی ناپ تول کر ہے، اور بولتا تو یوں ہے کہ الفاظ کے بجائے فیصلے نکلتے ہیں۔نقّارے کی کھال پر وقت کی باریک دراڑیں تھیں، جیسے کسی طاقتور چہرے پر عمر کی لکیریں—وہ لکیریں جو کمزوری نہیں بلکہ تجربہ کہلاتی ہیں۔

اس ساز کی تیاری ایک عام کاریگری نہ تھی بلکہ ایک امتحان تھا۔سب سے پہلے لکڑی کا انتخاب کیا گیا—نرم نہیں، بہت زیادہ سخت بھی نہیں۔کاریگر جانتے تھے کہ اگر لکڑی میں حد سے زیادہ سختی ہو تو آواز کرخت ہو جائے گی، اور اگر نرمی زیادہ ہوئی تو گونج میں کھوکھلا پن آ جائے گا۔بالکل ویسے ہی جیسے اقتدار میں توازن نہ ہو تو وہ ظلم یا کمزوری میں بدل جاتا ہے۔لکڑی کو مہینوں دھوپ اور ہوا میں رکھا گیا، بارش سے بچایا گیا، مگر نمی سے مکمل کاٹا نہیں گیا—جیسے کسی کو زندگی کی سختیوں سے گزارا جائے مگر احساس سے محروم نہ کیا جائے۔

کھال کے انتخاب میں بھی بڑی احتیاط برتی گئی۔یہ کسی ایسے جانور کی کھال نہ تھی جو آرام میں پلا ہو۔یہ اس وجود سے لی

گئی تھی جس نے سفر، دھوپ، پیاس اور خوف سب کچھ دیکھا ہو۔ کیونکہ نقارہ صرف وہی کھال برداشت کر سکتا تھا جو ضرب سہنے کی عادی ہو۔ جب وہ کھال لکڑی کے دائرے پر چڑھائی گئی تو کاریگر کے ہاتھ کانپ رہے تھے؛ ایک لمحے کی غلطی اور سارا تناؤ بیکار ہو جاتا۔ یہی حال اس مقتدر کا ہوتا ہے جو اقتدار کے منصب پر بیٹھتا ہے—ذرا سی لغزش، اور پورا وقار زمین پر آ گرتا ہے۔

نقّارہ بجایا نہیں جاتا تھا، اس پر ضرب لگائی جاتی تھی۔ اور یہ ضرب عام نہیں ہوتی تھی؛ اس میں ارادہ شامل ہوتا تھا۔ جب اس پر ہاتھ پڑتا تو آواز صرف فضا میں نہیں پھیلتی تھی بلکہ جسموں سے ٹکرا کر دلوں میں اتر جاتی تھی۔ یہ آواز کسی راگ کی طرح نہیں بہتی تھی بلکہ حکم کی طرح گرتی تھی۔ اس کی گونج دیواروں سے ٹکرا کر لوٹتی تو یوں لگتا جیسے فیصلہ سنایا جا رہا ہو—ناقابلِ تردید، ناقابلِ فراموش۔

نقّارہ گفتگو سے نہیں بلکہ موجودگی سے بات کرتا ہے۔ وہ جو محفل میں آئے تو قہقہے خود بخود دب جائیں، اور لوگ سیدھے ہو کر بیٹھ جائیں۔ اس کی خاموشی میں بھی شور ہوتا ہے، اور اس کے شور میں بھی ایک عجیب سی خاموشی۔ نقّارہ بھی خاموش حالت میں کم خوفناک نہ تھا؛ اس کا ساکت وجود بھی ایک انتباہ تھا، جیسے کوئی طاقت ور وجود جو کچھ کہے بغیر بھی سب کچھ کہہ دیتا ہے۔

نقّارے کی خوبصورتی نزاکت میں نہ تھی۔ وہ کسی ستار یا بانسری کی طرح دل کو چھو لینے والا ساز نہیں تھا۔ اس کا حسن اس کے وزن میں تھا، اس کی گہرائی میں، اس کے دائرے کی تکمیل میں۔ وہ مکمل تھا، مگر اس تکمیل میں لچک کم تھی۔ یہی اس کی طاقت تھی اور یہی اس کی کمزوری۔ کیونکہ جو مکمل ہو جاتا ہے، وہ بدلنے سے ڈرنے لگتا ہے۔

نقّارہ ایسی شخصیت تھی جس نے زندگی میں سب کچھ پایا مگر سکون کم۔ جس کے کندھوں پر خاندان، نظام، روایت اور قانون سب رکھ دیے گئے ہوں۔ ایسا وجود جو دوسروں کو سہارا دیتا ہے مگر خود کسی کے کندھے پر سر نہیں رکھ سکتا۔ نقّارہ بھی ہمیشہ اکیلا بجتا تھا؛ اس کے ساتھ کوئی ہم ساز نہیں تھا، کیونکہ اقتدار میں شراکت کم ہی نصیب ہوتی ہے۔

نقّارخانے میں جب بادشاہ اس ساز کے قریب آیا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے چھوا نہیں، بس قریب کھڑا ہو کر کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ شاید اس لیے کہ وہ جانتا تھا: جو چیز اقتدار کی علامت ہو، اسے چھوا نہیں جاتا، اسے سمجھا جاتا ہے۔ نقّارہ اس وقت خاموش تھا، مگر اس کی خاموشی میں آنے والے تمام راگوں کی بنیاد موجود تھی۔ کیونکہ جب تک ضرب نہ ہو، لے بے معنی رہتی ہے۔

یوں نقّارہ نقّار خانے کا پہلا ساز نہ تھا بلکہ پہلا اصول تھا۔ وہ اعلان تھا کہ اس ہال میں جو کچھ بھی بجے گا، وہ صرف موسیقی نہیں ہوگی، بلکہ فطرت کی وہ صدائیں ہوں گی جو طاقت، انا، ذمہ داری اور تنہائی سے جنم لیتی ہیں۔

نقّار خانے کے اس گوشے میں جہاں روشنی جان بوجھ کر مدھم رکھی گئی تھی، ستار کا مقام تھا۔ یہ کوئی اتفاق نہ تھا؛ ستار تیز روشنی میں اپنی بات پوری طرح نہیں کہہ پاتا۔ اس کا وجود نیم سایوں میں زیادہ سچ بولتا ہے، جو ہجوم میں کم اور تنہائی میں زیادہ خود ہوتا ہے۔ اس کا جسم لمبا، دبلا اور ہلکا سا خمیدہ تھا، گویا برسوں کے احساسات نے اس کی قامت میں جھکاؤ پیدا کر دیا ہو۔ اس کی سطح پر چمک نہیں بلکہ ایک دھیمی سی روشنی تھی—ایسی روشنی جو آنکھوں کو نہیں چبھتی، دل میں اترتی ہے۔
ستار کی تیاری کا عمل بھی ایک باطنی سفر تھا۔ لکڑی کے انتخاب سے ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ ساز طاقت کے لیے نہیں، برداشت کے لیے بنایا جا رہا ہے۔ کاریگر نے ایسی لکڑی چنی جو اندر سے نرم تھی مگر بیرون سے مضبوط—ایسا وجود جو بظاہر سنبھلا ہوا نظر آتا ہے مگر اندر جذبات کے سیلاب روکے بیٹھا ہو۔ لکڑی کو تراشنے سے پہلے اسے مہینوں خاموشی میں رکھا گیا۔ نہ ہتھوڑا، نہ چھینی—صرف انتظار۔ کیونکہ ستار جلدی میں نہیں بنتا؛ جیسے حساس فرد جلدی میں بالغ نہیں ہوتا۔
جب چھینی پہلی بار لکڑی پر پڑی تو وہ وار نہ تھا، اعتراف تھا۔ ہر ضرب کے ساتھ لکڑی سے ایک آہ نکلتی، جو صرف کاریگر سنتا تھا۔ اس نے جان لیا تھا کہ یہ ساز جتنا آہستگی سے تعمیر ہوگا، اتنا ہی گہرا بولے گا۔ ستار کے خم اسی آہستگی کی یادگار تھے— کوئی تیز زاویہ نہیں، کوئی بے رحم لکیر نہیں۔ سب کچھ نرمی سے، جیسے کسی کے دل کی بات احتیاط سے کہی جائے۔
ستار کی تاریں اس کے اعصاب تھیں۔ باریک، تناؤ میں بندھی ہوئی، ذرا سی بے توجہی سے کانپ اٹھنے والی۔ ہر تار الگ مزاج رکھتی تھی؛ کوئی زیادہ حساس، کوئی نسبتاً مضبوط۔ مگر سب ایک ہی جسم سے بندھی تھیں، جیسے کسی کے اندر مختلف احساسات ایک ہی دل سے جڑے ہوتے ہیں۔ جب ان تاروں کو کھینچا گیا تو آواز نہیں نکلی— آواز تب نکلی جب انہیں چھوڑا گیا۔ یہ ستار کا پہلا سبق تھا: گرفت میں نہیں، رہائی میں صدا ہے۔
جب ستار بجتا تو یوں لگتا جیسے کوئی بات پوری نہ ہو رہی ہو۔ اس کی لے سوال بن کر ابھرتی، پھر ہوا میں معلق رہ جاتی۔ یہی اس کی پہچان تھی۔ وہ ساز کی اس فطرت کی نمائندگی کرتا تھا جو یقین سے زیادہ تلاش میں جیتا ہے۔ ستار خوشی میں بھی بجتا تو اس میں ہلکی سی اداسی شامل ہوتی، اور غم میں بجتا تو اس میں امید کی ایک باریک لکیر ضرور موجود رہتی۔ جیسے حساس فرد کبھی مکمل مایوس نہیں ہوتا— وہ دکھ میں بھی امکان تلاش کر لیتا ہے۔

ستار کی خوبصورتی اس کی نزاکت میں تھی۔ اسے زور سے نہیں بجایا جا سکتا تھا؛ جبر اس کی آواز کو بے سُرا کر دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر کوئی اسے بجانے کا اہل نہیں تھا۔ صرف وہی شخص جس کے ہاتھوں میں ٹھہراؤ اور دل میں صبر ہو، ستار سے بات کر سکتا تھا۔ یہ ساز چیخ کر اپنی بات نہیں کہتا تھا؛ وہ سننے والے سے قربت مانگتا تھا۔ جیسے کوئی حساس انسان جو توجہ کے بغیر ٹوٹ جاتا ہے۔

ستار وہ ساز ہے جو محفل میں سب سے آخر میں بولتا ہے، مگر جب بولتا ہے تو بات دیر تک دل میں رہتی ہے۔ وہ جو تعریف سے زیادہ سمجھ چاہتا ہے، اور شور سے زیادہ خاموشی۔ اس کی آنکھیں باتیں کرتی ہیں اور لب اکثر خاموش رہتے ہیں۔ ستار بھی بجنے کے بعد فوراً خاموش ہو جاتا تھا، جیسے کہہ رہا ہو: "اب تم خود سوچو۔"

نقّارخانے میں جب بادشاہ ستار کے قریب آیا تو اس نے قدم آہستہ رکھے۔ شاید اسے بھی معلوم تھا کہ یہاں زور نہیں چلتا۔ اس نے ستار کو چھوا تو تاریں ہلکی سی کانپیں — آواز کے بغیر۔ یہ محض ایک سلام تھا، جیسے دو حساس روحیں ایک دوسرے کو پہچان لیں۔

یوں ستار نقّارخانے کا دوسرا ساز نہ تھا بلکہ دوسرا مزاج تھا۔ نقّارے کی ضرب کے بعد ستار کی لرزش نے واضح کر دیا کہ فطرت صرف طاقت سے نہیں بنتی؛ اسے احساس، سوال اور تنہائی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ستار نے یہ اعلان کیا کہ اس ہال میں دل کی بات بھی سنی جائے گی — چاہے وہ پوری نہ بھی ہو۔

اگلی باری بانسری کی تھی۔

بانسری کسی نمایاں مقام پر رکھی ہوئی نہ تھی۔ نہ اسے مرکز نصیب ہوا، نہ کسی بلند چبوترے کی عزت۔ وہ ایک سادہ سے ستون کے ساتھ ٹکی ہوئی تھی، جیسے کوئی درویش مسجد کے صحن میں خاموشی سے بیٹھا ہو — نہ خود کو پیش کرتا ہوا، نہ چھپاتا ہوا۔ مگر جس کی نگاہ رک جائے، وہ جان لے کہ اصل بات یہی ہے۔ بانسری کا وجود ہی اس کا اعلان تھا: سادگی، خالی پن، اور فنا۔

بانسری دیگر سازوں کی طرح بھاری بھرکم نہ تھی۔ اس میں نہ کھال تھی، نہ تار، نہ پیچیدہ ساخت۔ وہ محض ایک بانس کا ٹکڑا تھی — کھوکھلا، سیدھا، ہلکا۔ مگر یہی اس کی سب سے بڑی معنویت تھی۔ کیونکہ بانسری کو بجانے کے لیے کسی طاقت کی نہیں، کسی ہنر کی نمائش کی نہیں، بلکہ سانس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور سانس وہ شے ہے جو سب کو برابر ملی ہے، امیر کو بھی، فقیر کو بھی، بادشاہ کو بھی، درویش کو بھی۔

بانسری کی تیاری کا پہلا مرحلہ بھرنے کا نہیں، خالی کرنے کا تھا۔ بانس کو کاٹا گیا، اس کا مغز نکالا گیا، اس کے اندر کی گرہیں توڑی گئیں۔ یہ ایک دردناک عمل تھا، جیسے کسی انسان سے اس کا گھمنڈ، اس کی انا، اس کے دعوے چھین لیے جائیں۔ مگر بانسری اسی عمل کے بغیر بانس ہی رہتی — ساز نہیں بنتی۔ یہی درویشی کا پہلا سبق ہے: جب تک اندر خالی نہ ہو، آواز پیدا نہیں ہوتی۔

پھر اس بانس میں سوراخ کیے گئے۔ یہ سوراخ محض تکنیکی ضرورت نہ تھے؛ یہ زخم تھے، تجربات تھے، زندگی کے وہ لمحے تھے جن سے گزر کر انسان کچھ کہنے کے قابل ہوتا ہے۔ ہر سوراخ اپنی جگہ ناپ کر بنایا گیا، ذرا سا فرق اور لے بگڑ جاتی۔ بالکل ویسے ہی جیسے کسی کے دکھ اگر حد سے بڑھ جائیں تو شخصیت بکھر جاتی ہے، اور اگر نہ ہوں تو گہرائی پیدا نہیں ہوتی۔ بانسری میں حسن توازن کا ہے — نہ کم، نہ زیادہ۔

بانسری کی آواز اس وقت تک وجود میں نہیں آتی جب تک کوئی اپنی سانس اس میں نہ ڈالے۔ یوں اصل ساز بانسری نہیں بلکہ سازندہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کی بانسری الگ بولتی ہے۔ کسی کی سانس میں ٹھہراؤ ہے، کسی میں جلدی؛ کسی میں دعا ہے، کسی میں فریاد۔ بانسری سب کو قبول کرتی ہے، کسی کو رد نہیں کرتی۔ وہ یہ نہیں پوچھتی کہ سانس کس کی ہے، بس اسے آواز میں بدل دیتی ہے۔ یہ اس فرد کی علامت ہے جو دوسروں کو اظہار دیتا ہے، خود پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

بانسری کی لے میں کوئی حکم نہیں، کوئی سوال نہیں، کوئی احتجاج نہیں۔ وہ بس بہتی ہے۔ کبھی خوشی کی صورت میں، کبھی جدائی کی طرح، کبھی کسی یاد کی مہک بن کر۔ اس کی آواز سن کر یوں لگتا ہے جیسے وقت رک گیا ہو، اور لمحہ پھیل کر ازل سے ابد تک چلا گیا ہو۔ یہی فنا کا تصور ہے — اپنے آپ سے نکل کر کسی بڑے دائرے میں شامل ہو جانا۔

بانسری وہ ساز ہوتا ہے جو تعریف سن کر مسکرا دے اور تنقید سن کر بھی خاموش رہے۔ جو کسی مجلس میں سب سے پیچھے بیٹھے مگر سب سے پہلے یاد رہ جائے۔ اس کے پاس کوئی دعویٰ نہ ہو، مگر اس کی موجودگی سکون دے۔ وہ کسی کو قائل نہیں کرتا، بس متاثر کرتا ہے۔ بانسری بھی کبھی چیختی نہیں؛ وہ دل پر دستک دیتی ہے۔

بانسری کا حسن اس کی بے رنگی میں ہے۔ اس پر نہ نقش و نگار تھے، نہ چمک۔ وہ جیسی تھی، ویسی ہی رہی۔ کیونکہ درویش بدل کر نہیں، رہ کر پہچانا جاتا ہے۔ اس کی خوبصورتی ظاہر میں نہیں، اثر میں تھی۔ نقّار خانے میں بہت سے ساز ایسے تھے جو دیکھنے میں شاندار تھے، مگر بانسری سننے کے بعد خاموشی بھی خوبصورت لگنے لگتی تھی۔

جب بانسری بجتی تو نقّار خانہ بھی اپنی سانس روک لیتا۔ دیواریں، ستون، چراغ—سب سننے لگتے۔ جیسے سب کو یاد آ گیا ہو کہ اصل موسیقی باہر نہیں، اندر پیدا ہوتی ہے۔ بانسری کی لے کسی اختتام پر نہیں پہنچتی؛ وہ آہستہ آہستہ تحلیل ہو جاتی ہے، جیسے دعا آمین پر نہیں، خاموشی پر ختم ہوتی ہے۔

بادشاہ جب بانسری کے سامنے رکا تو اس نے کوئی سوال نہ کیا۔ شاید اس لیے کہ یہاں سوال کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس نے صرف آنکھیں بند کیں، اور ایک لمحے کے لیے اپنی سانس کو محسوس کیا۔ کیونکہ بانسری نے اسے یاد دلایا تھا کہ اقتدار بھی آخر کار سانس کا محتاج ہے۔

یوں بانسری نقّار خانے کا تیسرا ساز نہیں تھی، بلکہ تیسری حقیقت تھی: یہ کہ کوئی جتنا خالی ہوتا ہے، اتنا ہی بامعنی ہوتا ہے۔ اور جو خود کو فنا کر لیتا ہے، وہی دوسروں کے لیے صدا بن جاتا ہے۔

قافلہ اب رباب کے قریب آیا۔

نقّار خانے کے جس حصّے میں روشنی سیدھی نہیں پڑتی تھی بلکہ دیواروں سے پھسل کر آتی تھی، وہاں رباب رکھا تھا۔ وہ نہ مرکز میں تھا، نہ گوشہ تنہائی میں۔ بلکہ ایک ایسے مقام پر جہاں سے پورا ہال دکھائی دیتا تھا۔ یہ اس کی فطرت کے عین مطابق تھا۔ رباب وہ ساز ہے جو خود منظر میں کم آتا ہے مگر منظر کو جوڑے رکھتا ہے، جیسے خاندان میں وہ بزرگ جو خاموش بیٹھا سب کو دیکھتا ہے اور وقت آنے پر ایک جملہ کہہ کر بکھرتی بات کو سمیٹ دیتا ہے۔

رباب کا جسم بھاری تھا، مگر بوجھل نہیں۔ اس کی لکڑی میں صدیوں کی یاد دبی ہوئی تھی—وہ لکڑی جو ایک موسم میں نہیں، کئی موسموں میں پکی تھی۔ اس کی سطح پر تصنع کی چمک نہیں تھی بلکہ ہاتھوں کی ملمع کاری تھی؛ جا بجا انگلیوں کے نشان، جیسے دعا کے بعد پیشانی پر رہ جانے والی نمی۔ اس کے پیٹ پر تنی ہوئی کھال ایسی تھی جیسے کسی ذمہ دار انسان کے چہرے پر جمی وقار کی شکنیں—نہ سخت، نہ ڈھیلی؛ بس اتنی کہ ضرب سہہ سکے اور آواز کو تھام لے۔

رباب کی تیاری محض ایک کاریگری نہیں تھی؛ یہ سلسلہ نسب تھا۔ کہا جاتا تھا کہ ہر رباب اپنے ساتھ ایک خاندان کی یاد لے کر پیدا ہوتا ہے۔ کاریگر جب لکڑی تراشتا تو اپنے باپ کا ہاتھ یاد رکھتا، اور باپ اپنے باپ کا۔ یوں چھینی کے ہر وار میں وقت شامل ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ رباب جلدی میں نہیں بنتا۔ اسے پکنے کے لیے خاموشی، اندھیرا اور انتظار درکار ہوتا ہے—وہی چیزیں جو فرد کو بالغ بناتی ہیں۔

جب رباب کے تار لگائے گئے تو ان کی تعداد کم رکھی گئی۔ رباب بہت زیادہ باتیں نہیں کرتا؛ وہ چنی ہوئی بات کرتا ہے۔

ہر تار ایک نسل کی طرح تھا — اپنی جگہ مضبوط، اپنی ذمہ داری میں بندھا ہوا۔ تاروں کے بیچ فاصلہ ناپ کر رکھا گیا، جیسے خاندان میں رشتوں کا فاصلہ: بہت زیادہ ہو تو اجنبیت، بہت کم ہو تو گھٹن۔ رباب کا حسن اسی توازن میں تھا۔

رباب کی آواز میں ماضی بولتا تھا۔ یہ آواز تیز نہیں ہوتی، مگر گہری ہوتی ہے۔ جب یہ بجتا تو یوں لگتا جیسے کوئی قصہ سنایا جا رہا ہو — ایسا قصہ جس میں جنگ بھی ہے، ہجرت بھی، صبر بھی اور واپسی بھی۔ اس کی لے میں نہ ستار کی طرح سوال ہوتا ہے، نہ بانسری کی طرح فنا؛ اس میں قبولیت ہوتی ہے۔ قبولیتِ وقت، قبولیتِ زخم، قبولیتِ تقدیر۔ یہ ایسا وجود ہوتا ہے جو سب کچھ بدلتے دیکھ کر بھی خود کو نہیں بدلتا۔

رباب کی خوبصورتی اس کے وقار میں تھی۔ وہ کسی کو متاثر کرنے کے لیے نہیں بجتا تھا، مگر جو اسے سنتا، دیر تک اس کے سائے میں رہتا۔ اس کی آواز میں ایک عجیب سی ٹھہراؤ تھا، جیسے کسی بزرگ کے پاس بیٹھ کر دل خود بخود آہستہ ہو جائے۔ رباب چیخ کر اپنی بات نہیں کہتا؛ وہ انتظار کرتا ہے کہ سننے والا تیار ہو۔

رباب وہ ساز ہے جس کے ہاتھ کھردرے ہیں، مگر لمس میں شفقت ہے۔ جو نئی باتوں پر فوراً یقین نہیں کرتا، مگر پرانی باتوں کو بھی بے سبب نہیں چھوڑتا۔ وہ جو بچوں کو نام نہیں دیتا، کہانیاں دیتا ہے۔ جو نصیحت کم اور مثال زیادہ ہوتا ہے۔ رباب بھی اسی طرح مثال تھا — بجا تو سہی، مگر دکھا کر نہیں؛ سہارا دے کر۔

رباب کا ایک اور کمال یہ تھا کہ وہ دوسرے سازوں کو سنبھال لیتا تھا۔ نقّارے کی ضرب اگر حد سے بڑھ جاتی تو رباب کی گہرائی اسے تھام لیتی۔ ستار کی لرزش زیادہ نازک ہو جاتی تو رباب کی ٹھہراؤ اسے زمین دیتا۔ بانسری کی فنا اگر ہوا میں تحلیل ہونے لگتی تو رباب کی لے اسے یاد میں بدل دیتی۔ یوں رباب پورے نقار خانے کی ریڑھ کی ہڈی تھا — نظر نہ آنے والی مگر لازم۔

جب بادشاہ رباب کے قریب آیا تو اس نے ادباً سر جھکایا۔ یہ سر جھکانا اقتدار کے خلاف نہ تھا بلکہ روایت کے سامنے تھا۔ اس نے رباب کو نہیں چھوا؛ شاید اس لیے کہ کچھ چیزیں چھونے سے نہیں، ماننے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لمحے نقّار خانے میں ایک عجیب سی خاموشی پھیل گئی — ایسی خاموشی جو خالی نہیں ہوتی بلکہ بھری ہوتی ہے۔

رباب کی لے دیر تک نہیں رہتی، مگر اس کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ جب آواز ختم ہو جاتی ہے تو سننے والے کے اندر کچھ رہ جاتا ہے — ایک یاد، ایک وزن، ایک ذمہ داری۔ یہی وجہ ہے کہ رباب کو اکثر تنہائی میں بجایا جاتا تھا؛ محفل میں نہیں، خود کلامی میں۔ کیونکہ یہ ساز انسان کو دوسروں سے زیادہ خود سے ملواتا ہے۔

یوں رباب نقّارخانے کا چوتھا ساز نہیں تھا بلکہ چوتھی بنیاد تھا۔اس نے اعلان کیا کہ فرد صرف طاقت، حساسیت یا فنا سے مکمل نہیں ہوتا؛ اسے روایت، برداشت اور یاد کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اپنے سے پہلے والوں کو سنبھال لیتا ہے، وہی اپنے بعد والوں کو راستہ دے سکتا ہے۔

نقارخانے کے وسط میں، جہاں گنبد کے نیچے روشنی اور سایہ ایک دوسرے میں تحلیل ہو جاتے تھے، وہاں طبلہ ایک خاموش وقار کے ساتھ رکھا تھا۔ یہ ساز نہ تو بانسری کی طرح سانس پر جیتا تھا، نہ ستار کی طرح انگلیوں کی نرمی پر، اور نہ ہی رباب کی طرح روایت کی گہرائی میں گم تھا۔طبلہ اپنی جگہ ایک مکمل معاشرہ تھا— دو حصوں میں منقسم، مگر ایک ہی آہنگ میں بندھا ہوا۔

ایک طرف دایاں طبلہ تھا، چھوٹا، چست، سفید چمڑے سے مزیّن، جس کے وسط میں سیاہی کا دائرہ کسی مرکوز ذہن کی طرح دکھائی دیتا تھا۔دوسری طرف بایاں طبلہ— بڑا، بھاری، گہرے رنگ کا، جس کی آواز میں زمین کی گونج اور وقت کی تھکن شامل تھی۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل تھے، جیسے انسان کا وجود فرد اور جماعت کے بیچ معلق رہتا ہے۔

طبلے کی ساخت معاشرت کی سب سے گہری تمثیل تھی۔اس کا چمڑا جانور کی کھال سے بنتا، مگر اس پر محنت، صبر اور ترتیب ثبت ہوتی۔ گوند، آٹا، لوہا اور آگ— چاروں عناصر اس کی تیاری میں شامل ہوتے، جیسے کسی کی شخصیت فطرت، تجربے، دکھ اور شعور سے بنتی ہے۔ ہر تہہ ایک کردار ادا کرتی، اور اگر ایک بھی تہہ کمزور ہو جاتی تو پورا آہنگ بکھر جاتا۔

اس ساز کی اصل روح اس کے ہاتھوں میں تھی۔ایک ہاتھ زور لگاتا، دوسرا تھام لیتا؛ ایک ہاتھ سوال کرتا، دوسرا جواب دیتا۔یہی وجہ تھی کہ طبلہ کبھی تنہا نہیں بولا کرتا۔وہ ہمیشہ کسی کے ساتھ مکالمہ چاہتا— ستار، رباب، سرمنڈل یا کسی بھی اور کے دل کے ساتھ۔ جیسے معاشرہ اکیلے فرد سے نہیں بنتا، بلکہ ربط، گفتگو اور اختلاف سے جنم لیتا ہے۔

طبلے کی بولیاں— دھا، تن، نا، تِر، کِت— ایسی تھیں جیسے زبان کے بنیادی حروف۔ان میں اعلان بھی تھا اور احتجاج بھی، خوشی بھی اور شکوہ بھی۔بعض بول ایسے ہوتے کہ دل دھڑکنے لگتا، اور بعض ایسے کہ قدم خود بخود تھرکنے لگتے۔ یہ ساز نوع کی اجتماعی نبض پر ہاتھ رکھتا تھا۔

طبلے کا سیاہی والا مرکز ایک علامت تھا— مرکزِ شعور، مرکزِ توازن۔ اگر ضرب مرکز سے ہٹ کر پڑتی تو آواز بگڑ جاتی۔

یہی حال ہر نوع کا ہے جب وہ اپنے مرکزِ اخلاق، مرکزِ احساس یا مرکزِ عقل سے ہٹتا ہے تو اس کی آواز شور بن جاتی ہے، نغمہ نہیں رہتی۔

بادشاہ جب طبلے کے قریب آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کے کناروں پر وقت کے نشان ثبت ہیں۔ کہیں ہلکی سی دراڑ، کہیں چمڑے کی شکن — یہ سب اس بات کی علامت تھے کہ طبلہ صرف نیا نہیں، آزمودہ بھی ہے۔ جیسے معاشرہ صرف خوابوں سے نہیں بنتا، بلکہ شکستوں اور تجربوں سے سنورتا ہے۔

طبلے کی خوبصورتی ظاہری نہیں تھی۔ وہ نہ بانسری کی طرح نفیس تھا، نہ ستار کی طرح دلکش، مگر اس کی کشش اس کی افادیت میں تھی۔ وہ سب کو ساتھ لے کر چلتا تھا۔ اس کے بغیر محفل بکھری بکھری لگتی، جیسے افراد کے بغیر شہر محض عمارتوں کا ڈھیر ہو۔

اس ساز کی آواز میں نظم و ضبط تھا۔ ہر تال ایک حد میں بندھی ہوئی، ہر چکرا اپنے وقت پر مکمل۔ یہی طبلہ سبق سکھاتا تھا کہ آزادی بے لگام نہ ہو، اور نظم بے جان نہ بنے۔ توازن ہی اصل جمال ہے۔

طبلہ بجانے والا موسیقار خود بھی دوہرا وجود رکھتا تھا۔ اس کے ہاتھ الگ الگ حرکت کرتے، مگر دل ایک ہی رہتا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ایک ہاتھ بھی خودسر ہو گیا تو پورا ساز بدنام ہو جائے گا۔ یہ موسیقار دراصل معاشرے کا شعور تھا — جو سب کو ایک ساتھ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

نقار خانے میں طبلے کی موجودگی نے باقی سازوں کو بھی نظم دیا۔ بانسری کی سانس کو رفتار ملی، ستار کے سوال کو جواب، اور رباب کی روایت کو قدم۔ یوں طبلہ صرف ساز نہیں رہا، ایک نظام بن گیا۔

اب قافلہ نقار خانے کے اُس حصے میں پہنچا جہاں دیواریں آئینوں کی مانند تھیں اور چراغوں کی لو مدھم ہو کر سوچ میں بدل جاتی تھی، یہاں پڑا اگلا ساز، سرمنڈل، خاموشی کے ایک سمندر میں رکھا تھا۔ یہ خاموشی عدم نہیں تھی بلکہ ترتیب یافتہ فکر کی خاموشی تھی، جیسے کسی صاحبِ علم کا ذہن گفتگو سے پہلے اپنے اندر سوالات کی قطار بٹھا لیتا ہو۔ سرمنڈل دیکھنے میں سادہ، مگر باطن میں پیچیدہ تھا؛ جیسے وہ فرد جو کم گو ہو مگر اس کے اندر ایک پورا جہان آباد ہو۔

سرمنڈل کی ساخت کسی اور ساز سے مشابہ نہ تھی۔ لکڑی کا چپٹا، کشادہ بدن، جس پر بے شمار تاریں ایک باقاعدہ ترتیب سے تنی ہوئی تھیں۔ ہر تار کا اپنا مقام، اپنی حد، اپنا فاصلہ — نہ ایک انچ آگے، نہ پیچھے۔ یہ ترتیب کسی آمرانہ جبر کا نتیجہ

نہیں تھی بلکہ شعوری نظم کی علامت تھی۔ جیسے فرد جب علم اور تجربے کے بعد خود کو ترتیب دیتا ہے تو اس کی شخصیت میں ایک خاموش وقار پیدا ہو جاتا ہے۔

اس ساز کی تیاری میں سب سے زیادہ وقت پیمائش کو دیا جاتا تھا۔ کاریگر ہر تار کو لگانے سے پہلے رُک کر سوچتا، جیسے وہ کسی خیال کو زبان دینے سے پہلے تول رہا ہو۔ ذرا سی بے احتیاطی پورے آہنگ کو بگاڑ دیتی۔ یہی حال ذہن کا ہے—ایک غلط مفروضہ، ایک کچی رائے، اور پورا نظامِ فکر لڑکھڑا جاتا ہے۔ سرمنڈل اسی احتیاط کی تمثیل تھا۔

سرمنڈل کو بجایا نہیں جاتا تھا، اسے چھیڑا جاتا تھا۔ انگلیاں اس پر ایسے پھسلتی تھیں جیسے یادداشت کے اوراق پلٹے جا رہے ہوں۔ ہر تار ایک یاد، ایک خیال، ایک تجربہ تھا۔ کچھ تاریں بار بار چھوئی جاتیں، کچھ مدتوں خاموش رہتیں، مگر سب اپنی جگہ موجود رہتیں۔ یہ ساز لاشعور کا نقشہ تھا—جہاں کچھ یادیں نمایاں، کچھ دھندلی، مگر کوئی بھی مکمل طور پر غائب نہیں ہوتی۔

اس ساز کی آواز میں کوئی اچانک پن نہ تھا۔ نہ چیخ، نہ آہ۔ بس ایک ہموار، مسلسل بہاؤ—جیسے سوچ کی ندی۔ یہ آواز سن کر یوں لگتا کہ وقت سست ہو گیا ہے، اور وجود اپنے اندر جھانکنے لگا ہے۔ سرمنڈل کا حسن اسی ٹھہراؤ میں تھا۔ وہ سننے والے کو باہر کی دنیا سے اٹھا کر اندر کی دنیا میں بٹھا دیتا تھا۔

نقار خانے میں جب بادشاہ سرمنڈل کے سامنے رکا تو اس نے محسوس کیا کہ یہ ساز اس سے کچھ مانگ نہیں رہا، نہ داد، نہ توجہ۔ وہ بس موجود تھا—اپنے علم، اپنی ترتیب اور اپنی خاموش خدمت کے ساتھ۔ بادشاہ کو پہلی بار احساس ہوا کہ اقتدار کے شور میں اصل دانائی اکثر سنائی نہیں دیتی۔

سرمنڈل کی تاریں مختلف دھاتوں سے بنی تھیں— کچھ نرم، کچھ سخت، کچھ چمک دار، کچھ مدھم۔ یہ تنوع تہذیبی فکر کی علامت تھا۔ ہر خیال ایک جیسا نہیں ہوتا؛ کچھ تجربے نرم ہوتے ہیں، کچھ تلخ؛ کچھ روشن، کچھ سایہ دار۔ مگر جب سب ایک نظام میں بندھ جائیں تو ایک مکمل شعور تشکیل پاتا ہے۔

یہ ساز اکثر دوسرے سازوں کے پیچھے بجاتا تھا۔ اس کا کام نمایاں ہونا نہیں، سہارا دینا تھا۔ جیسے وہ کوئی جو محفل میں کم بولتا ہے مگر سب کی بات سمجھتا ہے۔ اس کی موجودگی سے آہنگ مکمل ہوتا، اور اس کی غیر موجودگی سے ایک خلا محسوس ہوتا، جسے کوئی اور ساز پُر نہ کر پاتا۔

سرمنڈل بجانے والا موسیقار عموماً جھکا ہوا بیٹھتا، اس کی نظریں تاروں پر جمی ہوتیں، جیسے کوئی قاری کتاب میں ڈوبا ہو۔

اس کے چہرے پر وجد نہیں، تفکر ہوتا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ساز جذبات کو نہیں، خیالات کو بیدار کرتا ہے۔

اس ساز کی خوبصورتی سادگی میں تھی۔ نہ اس پر نقش ونگار کی بھرمار، نہ چمک دمک۔ مگر جو آنکھ دیکھنا جانتی تھی، اسے معلوم ہو جاتا کہ یہ سادگی برسوں کی ریاضت کا حاصل ہے۔ جیسے وہ کوئی جو دکھاوے سے گزر کر وقار تک پہنچتا ہے۔

نقارخانے میں سرمنڈل ایک یاددہانی تھا کہ وجود صرف جذبہ نہیں، صرف روایت نہیں، صرف معاشرہ نہیں——وہ ایک ذہن بھی ہے۔ ایک ایسا ذہن جو ترتیب مانگتا ہے، خاموشی مانگتا ہے، اور وقت مانگتا ہے۔

یوں سرمنڈل فکری ذات بن کر سامنے آیا——وہ ذات جو کم سنائی دیتی ہے، مگر اگر نہ ہو تو ہر کوئی محض شور بن کر رہ جاتا ہے۔

قافلہ اب اگلے ساز کی طرف متوجہ ہوا جو کہ شہنائی تھا۔

نقارخانے کے اُس دروازے کے قریب جہاں سے باہر کی روشنی اندر داخل ہوتی تھی، شہنائی رکھی تھی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں اندر اور باہر کی دنیائیں ایک دوسرے سے ملتی تھیں۔ شہنائی کسی گوشہ خلوت کا ساز نہ تھی؛ وہ اعلان کا ساز تھی، آمد کا، آغاز کا۔ اس کی موجودگی ہی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ کچھ شروع ہونے والا ہے، جیسے زندگی میں بعض آوازیں تقدیر کی دستک بن کر آتی ہیں۔

شہنائی کی ساخت میں ایک عجیب سی وقار بھری سادگی تھی۔ لکڑی کا لمبا، مخروطی بدن، جس کے آخری سرے پر چاندی کی ہلکی سی چمک، یوں لگتی تھی جیسے زمین سے اٹھ کر آسمان کی طرف اشارہ کر رہی ہو۔ اس کا منہ تنگ، مگر پیغام وسیع تھا۔ جیسے وہ انسان جو خود مختصر ہو، مگر جس کے الفاظ پورے مجمع کو اپنی گرفت میں لے لیں۔

اس ساز کی تیاری میں لکڑی کا انتخاب سب سے اہم مرحلہ تھا۔ کاریگر برسوں پرانے درخت کو دیکھتا، اس کی رگوں، اس کے رنگ، اس کی خاموشی کو پرکھتا، پھر اسے چنتا۔ گویا وہ کسی فرد کے مزاج کا انتخاب کر رہا ہو۔ کیونکہ شہنائی میں اگر لکڑی کمزور ہو تو آواز چیخ بن جاتی ہے، اور اگر بہت سخت ہو تو آواز بے جان ہو جاتی ہے۔ یہی توازن فرد کی شخصیت میں بھی درکار ہوتا ہے۔

شہنائی کی آواز میں سانس کا دخل بانسری سے بھی زیادہ تھا، مگر اس سانس میں درویشی نہیں، اعلان تھا۔ یہ سانس کہتا تھا: "آؤ، دیکھو، سنو——زندگی شروع ہو رہی ہے۔" اسی لیے یہ ساز شادیوں، میلوں، فتح کے لمحوں اور نئی صبحوں سے وابستہ رہا۔ فرد بھی بعض اوقات اپنی پوری ہستی کو ایک اعلان میں سمیٹ دیتا ہے۔

اس ساز کے سوراخ فرد کے تجربات کی مانند تھے۔ ہر سوراخ ایک راستہ، ایک امکان۔ انگلی اگر ذرا سی ہٹ جائے تو پوری لے بدل جاتی۔ یہی حال فرد کا ہے — ایک غلط فیصلہ، اور زندگی کا آہنگ بدل جاتا ہے۔ شہنائی اسی نازک ذمہ داری کی علامت تھی۔

شہنائی بجانے والا موسیقار عام طور پر کھڑا ہو کر بجاتا تھا۔ اس کا سینہ کھلا، گردن اونچی، اور نگاہیں آگے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ساز جھک کر نہیں بجایا جا سکتا۔ یہ ساز حوصلہ مانگتا ہے، اعتماد مانگتا ہے۔ جیسے بعض کردار جو خود پیچھے رہ کر دوسروں کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔

شہنائی کی آواز میں خوشی کے ساتھ ایک ہلکی سی اداسی بھی شامل ہوتی تھی۔ کیونکہ ہر آغاز میں انجام کا سایہ موجود ہوتا ہے۔ شادی کی شہنائی میں رخصتی کا دکھ، فتح کی شہنائی میں زوال کا امکان۔ یہ ساز انسان کو یاد دلاتا تھا کہ خوشی بھی ذمہ داری مانگتی ہے۔

نقار خانے میں جب شہنائی بجی تو باقی ساز لمحہ بھر کو خاموش ہو گئے۔ نقارہ نے اپنی گونج روک لی، طبلے نے اپنی تال تھام لی، سرمنڈل نے اپنی سوچ سمیٹ لی۔ سب جانتے تھے کہ یہ آواز کسی نئے باب کا اعلان ہے۔ جیسے معاشرے میں بعض آوازیں تاریخ کا رخ موڑ دیتی ہیں۔

شہنائی کی خوبصورتی اس کی بے ساختگی میں تھی۔ وہ خود کو نہیں سجاتی، مگر سب کو سجا دیتی ہے۔ اس کی آواز میں کوئی فلسفیانہ پیچیدگی نہیں، مگر اس کی تاثیر گہری ہے۔ جیسے وہ فرد جو زیادہ سوچتا نہیں، مگر درست وقت پر درست بات کہہ جاتا ہے۔

بادشاہ نے شہنائی کے قریب کھڑے ہو کر محسوس کیا کہ اقتدار کا اصل حسن جشن بانٹنے میں ہے، نہ کہ جمع کرنے میں۔ شہنائی نے اسے سکھایا کہ حکم صرف اعلان نہیں، دعوت بھی ہو سکتا ہے۔

یوں شہنائی اس پہلو کی علامت بنی جو امید بانٹتا ہے، جو آغاز کو قابلِ ساعت بناتا ہے، اور جو جانتا ہے کہ ہر نئی راہ ایک آواز مانگتی ہے — صاف، بلند اور سچی۔

قافلہ اب نقار خانے کے اُس حصے میں پہنچا جہاں لکڑی کی خوشبو اور دھات کی ہلکی سی ٹھنڈک ایک دوسرے میں گھلی ہوئی تھی۔ یہاں ہارمونیم رکھا تھا۔ یہ ساز دیکھتے ہی احساس دلاتا تھا کہ یہ قدیم اور جدید کے بیچ کھڑا ہے۔ نہ مکمل طور پر درویش، نہ سراسر مشین — بلکہ اس کی طرح، جو فطرت اور ایجاد کے درمیان اپنی پہچان تراشتا ہے۔

ہارمونیم کی ساخت ایک بند صندوق جیسی تھی، مگر یہ صندوق رازوں کے بجائے سانس محفوظ رکھتا تھا۔لکڑی کا جسم، دھاتی ریڈز، اور پیچھے لگا ہوا ہوا بھرنے کا نظام — یہ سب مل کر ایک ایسا وجود بناتے تھے جو خود حرکت نہیں کرتا، مگر حرکت کے بغیر زندہ بھی نہیں رہتا۔یہی حال جدید شخص کا ہے: سہولتوں سے گھرا ہوا، مگر ان کا محتاج۔

اس ساز کی تیاری میں پیمائش، حساب اور ترتیب کا دخل بہت زیادہ تھا۔ یہاں وجد یا بے ساختگی کم، منصوبہ بندی زیادہ تھی۔کاریگر ہر پرزے کو اس طرح جوڑتا جیسے کوئی سماج اپنے قوانین ترتیب دیتا ہو۔ذرا سی بے قاعدگی پورے نظام کو بے آواز کر دیتی۔ہارمونیم یاد دلاتا ہے کہ نظم کے بغیر آزادی شور بن جاتی ہے۔

ہارمونیم کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی ہوا تھی۔ایک ہاتھ ہوا بھرتا، دوسرا سر نکالتا۔اگر ہوا زیادہ ہو جائے تو آواز کرخت، اور کم ہو تو مردہ۔یہی زندگی کا توازن ہے — جذبہ اور عقل، خواہش اور ضبط۔ یہ ساز سکھاتا تھا کہ صرف سانس کافی نہیں، اس کا مصرف بھی جاننا ضروری ہے۔

اس کی آواز میں نہ بانسری جیسی تنہائی تھی، نہ شہنائی جیسا اعلان، بلکہ ایک ٹھہرا ہوا بیان تھا۔جیسے کوئی چیختا نہیں، مگر بات سمجھا دیتا ہے۔اسی لیے ہارمونیم اکثر گائیکی کے ساتھ استعمال ہوتا تھا — وہ خود مرکز نہیں بنتا، مگر مرکز کو سہارا دیتا ہے۔

ہارمونیم کے بٹن قطار میں لگے تھے، سیاہ اور سفید — جیسے خیر و شر، دن و رات، ہاں اور نہ۔موسیقار کی انگلیاں ان پر ایسے چلتی تھیں جیسے کوئی ذہن فیصلوں کے درمیان سفر کر رہا ہو۔ ہر بٹن ایک امکان، ایک راستہ تھا، مگر سب ایک ہی صندوق سے جڑے ہوئے تھے۔

یہ ساز محفل میں سب سے زیادہ ہمہ گیر تھا۔کلاسیکی گائیکی ہو یا لوک دھن، عبادت ہو یا تفریح — ہارمونیم ہر جگہ اپنی جگہ بنا لیتا تھا۔یہ وجود کی موافقت پذیری کی علامت تھا، وہ صلاحیت جو بدلتے زمانے میں بھی خود کو زندہ رکھتی ہے۔

نقارخانے میں ہارمونیم کی موجودگی نے ایک نئی تہذیبی پرت کا اضافہ کیا۔یہ ساز روایت سے کٹا نہیں تھا، مگر روایت پر ٹھہرا بھی نہیں۔جیسے وہ فرد جو بزرگوں کا احترام کرتا ہے، مگر بچوں کے سوالوں سے نہیں گھبراتا۔

بادشاہ نے جب ہارمونیم کو دیکھا تو اس نے محسوس کیا کہ اقتدار صرف حکم چلانے کا نام نہیں، نظام چلانے کا بھی نام ہے۔ہارمونیم نے اسے بتایا کہ مسلسل آواز کے لیے مسلسل محنت درکار ہوتی ہے — ہوا بھرنے والا ہاتھ اگر تھک جائے تو نغمہ خاموش ہو جاتا ہے۔

ہارمونیم کی خوبصورتی اس کی افادیت میں تھی۔وہ نہایت سادہ دکھائی دیتا تھا، مگر اس کے بغیر بہت سی آوازیں ادھوری

رہتیں۔ جیسے وہ جو منظر میں نہیں، مگر منظر کو ممکن بناتا ہے۔

اب قافلے کا اگلا پڑاؤ نقار خانے کے ایک گوشے میں تھا جہاں سارنگی پڑی ہوئی تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں آواز سے پہلے احساس جنم لیتا ہے۔ سارنگی کو دیکھتے ہی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ ساز بجنے سے پہلے ہی کچھ کہہ رہا ہو — کوئی ان کہی داستان، کوئی دبی ہوئی آہ، کوئی ایسا درد جو لفظوں میں سمٹنے سے انکاری ہو۔

اس ساز کی تیاری میں لکڑی کا انتخاب ایک جذباتی عمل تھا۔ کاریگر درخت کے تنے کو محض کاٹتا نہیں تھا، بلکہ اس کی عمر، اس کے موسم، اس کے زخموں کو پڑھتا تھا۔ کیونکہ سارنگی کے لیے لکڑی وہی موزوں سمجھی جاتی تھی جس نے سردی بھی دیکھی ہو اور دھوپ بھی، بارش بھی سہی ہو اور ہوا کی تیزی بھی۔ جیسے کسی کی شخصیت بھی آسانیوں میں نہیں، آزمائشوں میں نکھرتی ہے۔

سارنگی کے تار کم تھے، مگر ان میں وسعت بے پناہ تھی۔ ہر تار ایک جذباتی سطح کی نمائندگی کرتا تھا — خوشی، غم، امید اور کرب۔ مگر اصل کمال ان تاروں کو چھیڑنے میں نہیں، بلکہ کمان میں تھا۔ کمان کا رگڑنا، ٹھہرنا، دباؤ اور نرمی — یہ سب رویّوں کی علامت تھے۔ کبھی زیادہ دباؤ چیخ میں بدل جاتا، اور کبھی نرمی سسکی بن جاتی۔

یہ ساز انگلیوں کے بجائے زیادہ تر دل سے بجایا جاتا تھا۔ جو موسیقار اپنے دکھ سے ناواقف ہو، وہ سارنگی کو کبھی سچا نہیں بجا سکتا تھا۔ اسی لیے سارنگی کے قریب وہی لوگ آتے جو ٹوٹے ہوئے ہوتے، مگر شکستہ نہیں؛ خاموش ہوتے، مگر خالی نہیں۔

سارنگی کی آواز میں ایک مسلسل لرزش ہوتی تھی، جیسے روح کبھی مکمل طور پر ساکن نہیں رہتی۔ یہ لرزش بتاتی تھی کہ زندگی ٹھہراؤ کا نہیں، حرکت کا نام ہے — خواہ وہ حرکت دکھ میں ہو یا خوشی میں۔ یہی لرزش سارنگی کو بانسری کی فنا اور طبلے کے نظم سے الگ کر دیتی تھی۔

جب سارنگی بجتی ہے تو فضا بدل جاتی ہے۔ نقّارہ کی گونج مدھم پڑ جاتی ہے، شہنائی کا اعلان پیچھے ہٹ جاتا ہے، اور ہارمونیم کی ترتیب ایک لمحے کے لیے خاموش ہو جاتی ہے۔ سب جانتے تھے کہ اب کوئی بول رہا ہے — بغیر لفظوں کے۔

سارنگی بجانے والا موسیقار عام طور پر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اس کا جسم ہلکا سا جھولتا ہے، جیسے وہ خود بھی اس درد کی

لہروں میں بہہ رہا ہو جو وہ پیدا کر رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ ساز سنانے کے لیے نہیں، بانٹنے کے لیے ہے۔
سارنگی کی خوبصورتی اس کی نزاکت میں تھی۔ ذرا سی بے احتیاطی اس کی گردن توڑ سکتی تھی، اس کے تار ٹوٹ سکتے تھے۔ جیسے فرد بھی جذبات کے بوجھ تلے اگر سنبھل نہ سکے تو بکھر جاتا ہے۔ مگر جب یہی نزاکت احترام پاتی، تو یہی ساز سب سے گہری آواز بن جاتا۔
بادشاہ جب سارنگی کے سامنے ٹھہرا تو اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ رعایا کے دل کی آواز حکم ناموں میں نہیں، آہوں میں چھپی ہوتی ہے۔ سارنگی نے اسے بتایا کہ اقتدار اگر درد نہ سنے تو بے معنی ہو جاتا ہے۔
یوں سارنگی فرد کے اس پہلو کی علامت بنا جو روتا بھی ہے، جیتا بھی ہے؛ جو ٹوٹتا بھی ہے، مگر اپنی ٹوٹ پھوٹ کو نغمہ بنا دیتا ہے۔ یہ ساز نقّار خانے میں دل کی دھڑکن تھا۔

قافلہ نقار خانے کے آخری حصے میں پہنچ گیا جہاں دف آویزاں تھا۔ نہ کسی تخت پر رکھا گیا، نہ کسی گوشے میں چھپایا گیا؛ بلکہ فضا میں معلق سا محسوس ہوتا تھا، جیسے اس کی اصل جگہ زمین نہیں بلکہ دلوں کے بیچ ہو۔ دف کوئی انفرادی ساز نہ تھا، یہ اجتماع کا ساز تھا، اختتام اور تکمیل کا ساز—وہ آواز جس میں فرد اپنی حدیں کھو دیتا ہے۔
دف کی ساخت سادہ تھی، مگر اس سادگی میں صدیوں کی ریاضت سمٹی ہوئی تھی۔ ایک گول لکڑی کا حلقہ، اس پر تنی ہوئی کھال—بس۔ نہ تار، نہ بٹن، نہ پیچیدہ نظام۔ مگر یہی سادگی اسے سب سے زیادہ شفیق بناتی تھی۔ جیسے وہ شخص جو علم، درد اور تجربے کے طویل سفر کے بعد آخرکار سادگی تک پہنچ جاتا ہے۔
اس ساز کی تیاری میں کسی خاص نقش و نگار کی ضرورت نہ تھی۔ کاریگر صرف یہ دیکھتا کہ لکڑی مضبوط ہو اور کھال کشیدہ—نہ زیادہ، نہ کم۔ کیونکہ دف میں ذرا سی ڈھیل غفلت بن جاتی ہے، اور ذرا سی سختی جبر۔ یہی توازن روح کا بھی امتحان ہے۔
دف کی آواز ضرب سے پیدا ہوتی تھی—براہِ راست۔ نہ انگلیوں کی نزاکت، نہ سانس کی احتیاط۔ ہاتھ اٹھتا اور گرتا، اور آواز جنم لیتی۔ یہ آواز کسی فلٹر سے نہیں گزرتی تھی، جیسے دل کی بات جو سیدھی زبان پر آ جائے۔ اسی لیے دف کی آواز میں بناوٹ نہیں، صداقت ہوتی تھی۔
یہ ساز ہمیشہ دائرے میں بجایا جاتا تھا۔ کوئی آگے، کوئی پیچھے نہیں؛ سب برابر۔ دف کا دائرہ یاد دلاتا تھا کہ آغاز اور انجام

ایک ہی نقطے پر ملتے ہیں۔ جو کچھ نقّار خانے میں شروع ہوا تھا، وہ یہاں آ کر مکمل ہوتا تھا۔

دف کی آواز میں وجد تھا — ایسا وجد جو فرد کو توڑتا نہیں، جوڑتا ہے۔ جب دف بجتا تو جسم خود بخود حرکت میں آ جاتا، جیسے روح نے زمین سے عارضی صلح کر لی ہو۔ یہ وہ لمحہ تھا جہاں عقل خاموش اور شعور رقصاں ہو جاتا تھا۔

جب دف بجتا ہے تو باقی تمام ساز خاموش ہو جاتے ہیں۔ نہ اس لیے کہ وہ ہار جاتے ہیں بلکہ اس لیے کہ ان کی کہی ہوئی باتیں اب ایک سادہ ضرب میں سمٹ چکی ہوتی ہیں۔ اقتدار، سوال، فنا، روایت، معاشرہ، ذہن، آغاز، نظم اور درد — سب اس ایک گونج میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔

دف بجانے والا کوئی ماہر موسیقار نہیں ہوتا ہے، اکثر وہ عام آدمی ہوتا ہے — کسان، درویش، مسافر۔ کیونکہ دف مہارت نہیں، حاضری مانگتا ہے۔ صرف ہاتھ اور دل۔ یہی اس کی سب سے بڑی جمہوریت ہے۔

بادشاہ جب دف کے سامنے آیا تو اس نے تخت سے اتر کر زمین پر قدم رکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اقتدار کی آخری منزل اختیار نہیں، شرکت ہے۔ دف نے اسے بتایا کہ رعایا کے ساتھ دھڑکنے والا دل ہی اصل حکومت ہے۔

دف کی خوبصورتی اس کی بے نیازی میں تھی۔ وہ نہ تعریف چاہتا تھا، نہ داد۔ بجتا تھا تو سب کو برابر کر دیتا تھا، اور خاموش ہوتا تھا تو بھی اپنے اثرات چھوڑ جاتا تھا۔ جیسے وہ فرد جو دنیا سے رخصت ہو جائے، مگر اس کی ضربیں وقت میں گونجتی رہیں۔

یوں دف وجود کے آخری مرحلے کی علامت بنا — جہاں فرد اپنی پہچان چھوڑ کر اجتماع میں گھل جاتا ہے، جہاں آواز نغمہ نہیں رہتی بلکہ تجربہ بن جاتی ہے، اور جہاں نقّار خانہ محض عمارت نہیں بلکہ وجود کا استعارہ بن جاتا ہے۔

بادشاہ نے نقّار خانے کا طویل دورہ مکمل کیا تو اس کے چہرے پر وہ مسکراہٹ نہ تھی جو تعریف کے بعد آتی ہے، بلکہ وہ خاموشی تھی جو سمجھ آ جانے کے بعد اترتی ہے۔ اس نے سب ساز دیکھے، سب کو سنا، سب کے مزاج، سب کی حدیں، سب کی قوتیں اور سب کی کمزوریاں پہچانیں۔ نقّارے نے اسے اقتدار کا غرور دکھایا، ستار نے سوالوں کی چبھن یاد دلائی، رباب نے روایت کا بوجھ اس کے کندھوں پر رکھا، طبلے نے معاشرے کی تال سکھائی، سرمنڈل نے ذہن کی ترتیب دکھائی، شہنائی نے آغاز کی خوشی سنائی، ہارمونیم نے نظم کی سہولت سمجھائی، سارنگی نے درد کی صداقت کو چھوا، اور دف نے اجتماع میں فنا ہونے کا مزہ چکھایا۔

مگر جب وہ سب کچھ دیکھ اور سن چکا، تو اس کے قدم بے اختیار اسی گوشے کی طرف مڑ گئے جہاں بانسری خاموش پڑی تھی — نہ کسی تخت پر، نہ کسی اعلان کے ساتھ، بس ایک سادہ سی لکڑی، جس کے اندر خالی پن آباد تھا۔

بادشاہ نے بانسری کو ہاتھ میں اٹھایا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی ہتھیار کو نہیں، کسی زخم کو تھامے ہوئے ہے۔ اس نے دربار کی طرف رخ کر کے کہا:

"میں نے سب ساز سنے، مگر مجھے سب سے زیادہ بانسری پسند آئی۔"

دربار میں سرگوشیاں اٹھیں۔ کسی نے سوچا کہ یہ انتخاب کمزوری کی علامت ہے؛ کسی نے گمان کیا کہ شاید بادشاہ نے نفاست کو طاقت پر ترجیح دے دی ہے۔ مگر بادشاہ نے ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش کیا، اور اپنی بات شروع کی — وہ بات جو محض تعریف نہ تھی، ایک فہم تھی۔

"بانسری اس وقت تک نہیں بولتی،" بادشاہ نے کہا، "جب تک سانس اور راز ایک نہ ہو جائیں۔

یہ ساز انگلیوں سے نہیں، نیت سے بجتا ہے۔ اس میں آواز اس وقت جنم لیتی ہے جب اندر کا راز سانس کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے۔"

اس نے بانسری کے سوراخوں کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ سوراخ،" وہ بولا، "زینت نہیں ہیں۔ یہ زخم ہیں۔ ہر سوراخ کسی محرومی کی یاد ہے۔ اگر لکڑی سلامت رہتی، تو بانسری کبھی نہ بنتی۔"

بادشاہ لمحہ بھر رکا۔ اس کی آواز میں وہی ٹھہراؤ تھا جو صرف تجربے کے بعد آتا ہے۔

"نقّارہ اپنی طاقت خود رکھتا ہے،" اس نے کہا، "وہ اعلان کرتا ہے، چاہے اندر کچھ ہو یا نہ ہو۔ ستار سوال پوچھتا ہے، رباب بوجھ اٹھاتا ہے، طبلہ تال باندھتا ہے، سارنگی روتا ہے — مگر بانسری کچھ نہیں کرتی، جب تک اسے پھونکا نہ جائے۔"

دربار پر خاموشی چھا گئی۔

"اور یہی بات اسے سب سے بڑا بناتی ہے،" بادشاہ نے کہا۔

"بانسری اپنی آواز کی مالک نہیں ہوتی۔ وہ مانگتی نہیں، وہ قبول کرتی ہے۔"

اس نے بانسری کو ہونٹوں کے قریب لا کر پھر واپس رکھ دیا، جیسے وہ جانتا ہو کہ ہر سانس اس ساز کے لائق نہیں۔

"یہ ساز مجھے وجود کی اصل حقیقت بتاتا ہے،" اس نے کہا۔

"وجود اس وقت تک کچھ نہیں، جب تک اس کے اندر خالی پن نہ ہو۔"

بادشاہ نے بتایا کہ بانسری بنانے والا کاریگر سب سے پہلے لکڑی کو چنتا ہے، پھر اسے کھوکھلا کرتا ہے۔

"یہ کھوکھلا پن،" وہ بولا، "کمزوری نہیں، اہلیت ہے۔ جو بھرا ہوا ہو، وہ سانس کو جگہ نہیں دیتا۔"

اس نے درباری علما کی طرف دیکھا۔

"علم بھی اگر انا سے بھرا ہو تو وحی نہیں اترتی،" اس نے کہا۔

"دل بھی اگر غرور سے لبریز ہو تو محبت کی آواز نہیں آتی۔"

بانسری کی آواز کے بارے میں اس نے کہا:

"یہ آواز چیختی نہیں، مگر دیر تک رہتی ہے۔

یہ اعلان نہیں، دعا ہے۔

یہ حکم نہیں، درخواست ہے۔

پھر اس نے ایک بات کہی جس پر دربار میں بیٹھے ہوئے سب لوگ چونک گئے:

"بانسری مجھے اس لیے عزیز ہے کہ یہ خود کچھ نہیں کہتی — یہ کسی اور کو بولنے دیتی ہے۔"

اس نے آسمان کی طرف دیکھا، جیسے وہ بات کسی فرد سے نہیں، کسی اور سے کر رہا ہو۔

"یہ ساز مجھے یاد دلاتا ہے کہ اصل فاعل ہم نہیں ہوتے۔ ہم محض راستہ ہوتے ہیں۔"

بادشاہ نے کہا کہ باقی تمام سازوں میں کسی نہ کسی درجے میں خودی شامل ہے۔

"کوئی اپنی آواز پر فخر کرتا ہے، کوئی اپنی پیچیدگی پر، کوئی اپنی قوت پر — مگر بانسری کے پاس فخر کے لیے کچھ نہیں۔"

وہ مسکرایا، مگر اس مسکراہٹ میں شکر زیادہ تھا۔

"بانسری کو معلوم ہے کہ اگر سانس نہ آئے، تو وہ لکڑی کا ایک ٹکڑا ہے۔"

اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔

"اور زندگی بھی یہی ہے۔"

پھر اس نے وہ بات کہی جس پر نقّار خانہ اپنی معنویت میں مکمل ہوا:

"زندگی بانسری بن کر پیدا نہیں ہوتی۔"

دربار میں سانس رک گئے۔

"زندگی کو تراشا جاتا ہے،" بادشاہ نے کہا،

"درد سے۔

نقصان سے۔

انتظار سے۔"

اس نے بانسری کے سوراخوں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا:

"ہر سوراخ ایک رخصتی ہے۔

ہر کٹ ایک جدائی۔

ہر خالی پن ایک دعا۔"

پھر اس نے آہستہ سے کہا:

"محبت زندگی کو خالی کرتی ہے۔

اور جب وجود خالی ہو جائے، تب کہیں جا کر ازلی سانس اس میں اترتی ہے۔"

یہ کہہ کر بادشاہ خاموش ہو گیا۔

نقّارخانہ بھی خاموش تھا۔

اور اس خاموشی میں، اگر کوئی کان رکھتا، تو بانسری کی آواز سن سکتا تھا—

وہ آواز جو صرف اسی کو سنائی دیتی ہے

جس کا سر سانس کے ساتھ ہم آہنگ ہو چکا ہو۔

وہ بانسری کو ہاتھ میں لے کر دیر تک دیکھتا رہا۔ لکڑی کا یہ باریک ٹکڑا، جس میں نہ کوئی چمک تھی نہ شان و شوکت، مگر اسی نے بادشاہ کے دل پر سب سے گہرا اثر چھوڑا تھا۔ اس کی نگاہ بانسری کے جسم میں بنے ہوئے چھ سیاہ سوراخوں پر ٹھہر گئی۔

بادشاہ نے وزیروں کی طرف رخ کر کے کہا:

"یہ بانسری تبھی بولتی ہے جب سانس کسی راز سے ہم آہنگ ہو۔ مگر اس کے جسم میں یہ چھ سوراخ کیوں ہیں؟ کیا یہ محض

فنی ضرورت ہیں یا ان میں کوئی معنی بھی پوشیدہ ہے؟"

وزیروں نے ادب سے سر جھکایا۔ ہر وزیر نے اپنی فہم کے مطابق ایک ایک سوراخ کی تعبیر پیش کی۔

پہلا وزیر، جو عمر اور تجربے میں سب سے بڑا تھا، آگے بڑھا اور بولا:

"جہاں پناہ! بانسری کا پہلا سوراخ زمین کے سب سے قریب ہے، کیونکہ یہ اس صفت سے متعلق ہے جو اسے زمین سے باندھے رکھتی ہے — یعنی نفس، انا، خودی۔"

اس نے کہا کہ نفس محض غرور کا نام نہیں، بلکہ وہ وہم ہے جس میں کوئی خود کو کائنات سے الگ سمجھتا ہے۔ عارف اسے نفسِ امّارہ کہتے ہیں۔ یہی خودی انکسار سے ٹوٹتی ہے، اور شجری عقل مند کی نظر میں اس کا وجود ہی تسلیم نہیں کیا جاتا۔

وزیر نے شاہ روم کا حوالہ دیا:

"تم سمندر میں ایک قطرہ نہیں، بلکہ قطرے میں پورا سمندر ہو — مگر شرط یہ ہے کہ 'میں' باقی نہ رہے۔"

وہ بولا:

"اگر یہ پہلا سوراخ بند ہو تو بانسری میں سانس تو داخل ہو جائے گی، مگر نغمہ پیدا نہیں ہوگا، صرف شور جنم لے گا۔ اسی طرح اگر انا بند نہ ہو تو اس کی عبادت بھی نمائش بن جاتی ہے اور اس کا علم بھی تکبر۔"

پھر اس نے مقدس سیاح کا قول دہرایا:

"مبارک ہیں وہ جو حلیم ہیں۔"

شجری عاقل کے مطابق:

"بانسری کو پہلے کھوکھلا کیا جاتا ہے، تب کہیں جا کر وہ ساز بنتی ہے۔ جسم بھی جب تک خالی نہ ہو، وہ پھونکنے والے کی سانس کا راستہ نہیں بن سکتا۔"

"جہاں پناہ! بانسری کھوکھلی ہو تو نغمہ بنتا ہے، اور عجز ہو تو معنی پیدا ہوتا ہے۔"

دوسرا سوراخ خواہش ہے۔ خواہش بذاتِ خود برائی نہیں، یہ ایک حرارت ہے۔ جیسے سانس — نہ ہو تو زندگی ختم، اور حد سے بڑھے تو سب کچھ جلا دے۔

اس نے دوہوں کے شاعر کی بات سنائی:

"جہاں خواہش تخت نشین ہو، وہاں خدا نہیں بیٹھتا۔"

"سالک کہتے ہیں کہ زیادہ خواہش بانسری کی نلکی کو جلا دیتی ہے۔شجری عاقل کے مطابق یہی طلب دکھ کی جڑ ہے۔مگر اگر یہی خواہش سنور جائے تو عشق بن جاتی ہے۔"

وہ بولا:

"بانسری سانس کو محدود کرتی ہے۔اگر کوئی حد نہ ہو تو نغمہ پیدا نہیں ہوتا۔اسی طرح خواہش اگر ضبط میں نہ رہے تو وہ ساز نہیں،ٹوٹا ہوا لکڑی کا ٹکڑا بن جاتا ہے۔"

"خواہش کو مارنا نہیں،سنوارنا ہوتا ہے۔یہی ضبط،نغمے کی بنیاد ہے۔"

تیسرا سوراخ، یہ سوراخ سب سے زیادہ بند رکھا جاتا ہے،کیونکہ یہ خوف کا سوراخ ہے۔

خوف انگلیوں کو اکڑا دیتا ہے،سانس کو روک دیتا ہے۔مقدس سیاح کا جملہ اس نے دہرایا:

"مت ڈرو۔"

"جب خوف اس سوراخ کو بند کرتا ہے تو سانس گھٹ جاتی ہے۔مگر جب اعتماد آتا ہے تو آواز صاف ہو جاتی ہے۔"

وہ بولا:

"ایمان وہ انگلی ہے جو خوف کو اٹھا دیتی ہے۔"

چوتھا سوراخ محبت ہے۔

"یہ بانسری کا دل ہے۔"

اس نے ہندی بانسری نواز کی بانسری کا ذکر کیا جو محبت سے سب کو اپنی طرف بلاتی ہے۔

پھر اس نے شاہ روم کا قول سنایا:

"محبت تمھارے اور ہر شے کے درمیان پل ہے۔"

"محبت کے بغیر نغمہ سرد ہوتا ہے،اور محبت کے ساتھ خاموشی بھی گانے لگتی ہے۔"

اس نے کہا:

"محبت بانسری کا مرکزی سُر ہے۔"

پانچواں سوراخ عقل ہے۔

"عقل فیصلہ کرتی ہے کہ کون سا سوراخ کھلے۔"

اس نے صوفی فلسفی کا حوالہ دیا:

"عقل چراغ ہے، سورج نہیں۔"

"اگر عقل حاکم بن جائے تو نغمہ بگڑ جاتا ہے۔ اسے خادم رہنا چاہیے۔"

وہ بولا:

"ذہن محافظ ہے، موسیقار نہیں۔"

چھٹا سوراخ — سپردگی ہے۔

"یہ سوراخ منہ کے سب سے قریب ہے، کیونکہ یہ سپردگی ہے۔"

عارف اسے فنا کہتے ہیں۔ ہندی صحیفے میں ہے:

"سب کچھ چھوڑ کر میری پناہ میں آ جاؤ۔"

مقدس سیاح نے کہا:

"میری نہیں، تیری مرضی پوری ہو۔"

"جب یہ سوراخ کھلتا ہے تو نغمہ ذاتی نہیں رہتا۔ بانسری خود کو بھول جاتی ہے۔"

"یہ وہ مقام ہے جہاں وجود خاموش ہوتا ہے، اور ازلی گیت سنائی دیتا ہے۔"

پہلا وزیر اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوا تو ہال میں ایک لمحے کے لیے سکوت چھا گیا۔ بانسری اب بھی بادشاہ کے ہاتھ میں تھی، اور اس کے سوراخ کسی ان کہی حقیقت کی طرح بادشاہ کی نگاہوں سے ہم کلام تھے۔ اسی اثنا میں دوسرا وزیر، جو طبعاً زیادہ متوازن محتاط اور دنیاوی و روحانی دونوں علوم سے آشنا تھا، آگے بڑھا۔ اس نے بانسری کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے گویا ہوا:

"جہاں پناہ! میں انہی چھ سوراخوں کو ایک اور زاویے سے دیکھتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ انسان کی باطنی قوتوں اور کمزوریوں کے وہ دروازے ہیں جن کے بغیر نہ جسم مکمل ہے اور نہ نغمہ۔"

پہلا سوراخ، یہ بانسری کا سب سے نچلا اور سب سے خطرناک سوراخ ہے۔ کیونکہ یہ نفس کی نمائندگی کرتا ہے — وہ انا جو فرد کو خود مرکز بنا دیتی ہے۔ اگر نفس بے لگام ہو جائے تو آواز نغمہ نہیں رہتی، محض شور بن جاتی ہے۔ بولنے والا بولتا ہے مگر اس کی بات دل تک نہیں پہنچتی، وہ عمل کرتا ہے مگر اس کے عمل میں حسن نہیں رہتا۔ مگر وزیر نے فوراً اضافہ کیا:

"نفس کو مکمل طور پر مٹانا بھی ممکن نہیں، اور نہ ہی مطلوب ہے۔ اگر اسے قابو میں رکھا جائے، نظم دی جائے، تو یہی نفس توانائی بن جاتا ہے—ترقی کی قوت، جدوجہد کا ایندھن۔"

انا کو قتل نہیں کیا جاسکتا، ضبط میں رکھا جاتا ہے۔ بانسری میں یہ سوراخ بند ہو تو سانس گھٹ جاتی ہے، اور کھلا رہے تو بے آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ توازن ہی سُر پیدا کرتا ہے۔

دوسرا سوراخ، غضب ہے، غصہ ہے۔ یہ نفس کے اندر کی آگ ہے۔ غصہ اگر بے قابو ہو تو پورے ساز کی ہم آہنگی بگاڑ دیتا ہے۔ انگلیاں کانپنے لگتی ہیں، سانس بے ترتیب ہو جاتی ہے، اور نغمہ بکھر جاتا ہے۔ مگر وزیر نے اسے صرف منفی قوت نہیں کہا:

"جب غضب کو پاک کر لیا جائے، تو یہی آگ جرات بن جاتی ہے، عدل کی طاقت، ظلم کے خلاف کھڑے ہونے کی ہمت۔"

سلجھا ہوا غصہ طاقت بن جاتا ہے۔ جیسے آگ اگر چراغ میں ہو تو روشنی دیتی ہے، اور اگر جنگل میں لگ جائے تو سب کچھ جلا ڈالتی ہے۔

تیسرا سوراخ، حرص، لالچ ہے۔ یہ سوراخ دنیا سے حد سے زیادہ وابستگی کی علامت ہے۔ حرص وہ کھلا سوراخ ہے جو توازن بگاڑ دیتا ہے۔ جب کسی کی گرفت دنیا پر بہت سخت ہو جائے تو بانسری کا وزن بگڑ جاتا ہے، آواز لرزنے لگتی ہے۔ ہر وقت زیادہ کی خواہش، زیادہ کا خوف—یہ سب نغمے کو بے چین کر دیتے ہیں۔

مگر اگر حرص کو قابو میں رکھا جائے تو یہی قناعت میں بدل جاتی ہے۔ قناعت وہ سُر ہے جو فرد کو سکون عطا کرتا ہے۔ ذرا سی بے اعتدالی پوری دھن کو خراب کر سکتی ہے۔

چوتھا سوراخ خوف کا ہے۔ یہ وہ خوف ہے جو ناطق کو خاموش کر دیتا ہے۔ کھونے کا خوف، مرنے کا خوف، لوگوں کا خوف۔

اگر یہ خوف غالب آجائے تو انگلیاں منجمد ہو جاتی ہیں، سانس رک جاتی ہے، اور ساز خاموش ہو جاتا ہے۔ ناطق بولنے سے ڈرنے لگتا ہے، جینے سے گھبرانے لگتا ہے۔ مگر جب یہی خوف پاک ہو جائے، تو خوفِ خدا بن جاتا ہے۔ یہ ایک عجیب روحانی تضاد ہے کہ مقدس خوف سب سے شیریں نغمہ پیدا کرتا ہے۔ یہ خوف فرد کو سنبھال دیتا ہے، اسے بے راہ روی سے بچاتا ہے، اور آواز میں وقار پیدا کرتا ہے۔

پانچواں سوراخ عقل کی علامت ہے۔ عقل ضروری ہے، **مگر** محدود۔ اگر عقل اکیلی حاکم بن جائے تو آواز خشک ہو جاتی ہے — صحیح **مگر** بے جان۔ حساب تو ہوتا ہے، **مگر** حرارت نہیں۔ منصوبہ تو ہوتا ہے، **مگر** کشش نہیں۔ جب عقل محبت کی رہنمائی میں ہو، تو حکمت پیدا ہوتی ہے۔ عقل کو دل کے پیچھے چلنا چاہیے، آگے نہیں۔ عقل نقشہ بناتی ہے، **مگر** سفر دل طے کرتا ہے۔

چھٹا سوراخ ہے عشق۔ وزیر کی آواز نرم ہوگئی۔ یہ سب سے اونچا سوراخ ہے، سانس کے سب سے قریب۔ عشق وہ قوت ہے جو باقی تمام سوراخوں کو نظم دیتی ہے۔ اگر عشق خالص ہو تو بانسری سے ازلی و ابدی موسیقی پھوٹتی ہے۔ یہاں نفس، غضب، حرص، خوف اور عقل سب اپنی اپنی حد میں آجاتے ہیں۔

ہال میں گہرا سکوت چھا گیا۔ بانسری بدستور خاموش تھی، **مگر** اس کی خاموشی میں اب کئی جہان بول رہے تھے۔

جب دوسرا وزیر خاموش ہوا تو ہال میں موجود روشنی جیسے اور مدھم ہوگئی۔ بانسری اب بادشاہ کے ہاتھ میں نہ تھی؛ وہ ایک مخملی میز پر رکھی تھی، جیسے خود کو گفتگو کے لیے پیش کر رہی ہو۔ اسی لمحے تیسرا وزیر، جو کم گو **مگر** نہایت گہرا سوچنے والا تھا، آہستگی سے آگے بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں فلسفے کی تھکن اور عرفان کی چمک ایک ساتھ موجود تھی۔

اس نے کہا:

"جہاں پناہ! میرے نزدیک بانسری کے یہ چھ سوراخ چھپے پردے ہیں۔ یہ وہ حجاب ہیں جو اگر بند رہیں تو فرد خاموش رہتا ہے، اور اگر کھل جائیں تو نغمہ بن جاتا ہے۔"

یہ پہلا سوراخ جسم ہے۔ اور جسم پہلا قید خانہ بھی ہے، اور پہلا وسیلہ بھی۔ جسم لذتوں کا طلب گار ہے: ذائقہ، لمس، آرام، آسائش۔ اگر وجود جسم کا غلام بن جائے تو یہی جسم اسے زمین سے باندھ دیتا ہے۔ بانسری میں اگر یہ سوراخ حد سے زیادہ کھل جائے تو آواز بھاری اور بے ڈھنگی ہو جاتی ہے۔ **مگر** جب جسم کو نظم مل جائے تو یہی قید خانہ ایک برتن بن جاتا ہے — ایک ظرف، جس میں روحانی سانس ٹھہر سکتی ہے۔ جسم تب قید نہیں رہتا، بلکہ عبادت بن جاتا ہے۔ ریاضت، ضبط — یہ سب اسی سوراخ کی تہذیب ہیں۔ بانسری بھی تبھی بولتی ہے جب اس کا پہلا سوراخ سانس کو روکنے کے بجائے سنبھالنا سیکھ لے۔

دوسرا سوراخ نفس ہے: غرور، شہوت، غلبے کی خواہش۔ یہ وہ مقام ہے جہاں فانی وجود 'میں' کہنا سیکھتا ہے۔" اور یہی 'میں' سب سے بڑا پردہ ہے۔ جب نفس بے لگام ہو تو فانی ہر آواز کو اپنی تعریف بنانا چاہتا ہے۔ بانسری میں یہ

سوراخ اگر بے قابو ہو تو نغمہ خود نمائی میں بدل جاتا ہے۔ لیکن جب نفس کو قابو کر لیا جائے تو یہی عاجزی، خدمت اور شکر میں بدل جاتا ہے۔ تب وہ خود کو مرکز نہیں سمجھتا، بلکہ راستہ سمجھتا ہے۔ نفس سدھ جائے تو سوراخ بند نہیں رہتا، صاف ہو جاتا ہے۔

تیسرا سوراخ ذہن ہے — سوال، شک، حساب، اندیشہ۔ ذہن کی فطرت سوچنا ہے۔ مگر اس کی بیماری زیادہ سوچنا ہے۔

بانسری میں اگر یہ سوراخ مسلسل حرکت میں رہے تو سانس ٹھہر نہیں پاتی۔ اسی طرح اگر ذہن مسلسل شور مچاتا رہے تو دل خاموش ہو جاتا ہے۔ جب ذہن خاموش ہوتا ہے، تو وضاحت پیدا ہوتی ہے۔ یہ خاموشی لاعلمی نہیں، بلکہ آگہی ہے۔ جیسے ٹھہرا ہوا پانی آسمان کا عکس دکھاتا ہے، ویسے ہی خاموش ذہن حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔

چوتھا سوراخ دل کا وہ حصہ ہے جو دکھ، حسد اور رنج سے بھرا ہوتا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں فرد سب سے زیادہ زخمی ہوتا ہے۔

اگر یہ سوراخ گندا رہے تو بانسری کی آواز میں کراہ پیدا ہو جاتی ہے۔ ناطق بولتا ہے تو شکوہ بولتا ہے، سنتا ہے تو بدگمانی کے ساتھ۔

مگر جب یہی دل صاف ہو جائے تو رحم، شفقت اور ہمدردی جنم لیتی ہے۔ درد تب زہر نہیں رہتا، دوا بن جاتا ہے۔ پاک دل سب سے نرم، مگر سب سے طاقتور سُر پیدا کرتا ہے۔

پانچواں سوراخ عقل ہے — منطق، دلیل، ترتیب۔ عقل حدیں جانتی ہے۔ مگر حقیقت کو نہیں ناپ سکتی۔ اگر عقل حاکم بن جائے تو بانسری کی آواز درست مگر بے جان ہو جاتی ہے۔ حساب میں سب ٹھیک، مگر ذوق ندارد۔ جب عقل سپرد ہو جائے تو حکمت پیدا ہوتی ہے۔ عقل کو جھکنا پڑتا ہے، تاکہ دل آگے بڑھ سکے۔ یہی جھکاؤ بانسری میں نرمی لاتا ہے۔

چھٹا سوراخ انا کا ہے۔ آخری سوراخ سب سے باریک، سب سے اونچا ہے۔ یہ شناخت ہے — میں کون ہوں؟

جب تک یہ سوراخ موجود ہے، ناطق اپنی آواز کو اپنی سمجھتا ہے۔ مگر جب یہ مٹ جائے تو فنا پیدا ہوتی ہے۔ یہاں ناطق غائب ہوتا ہے، اور نغمہ باقی رہتا ہے۔ آواز تبھی پیدا ہوتی ہے جب پردے دروازے بن جائیں۔ جو چیز رکاوٹ تھی، وہی راستہ بن جائے۔ تب بانسری بولتی ہے اور معنی پیدا ہو جاتا ہے۔

چوتھا وزیر آگے بڑھا تو اس کے چہرے پر ایک عجیب اطمینان تھا، جیسے وہ کسی طویل روحانی سفر سے لوٹ کر آیا ہو۔ اس

نے بانسری کو نہایت احترام سے دیکھا اور کہا:

جہاں پناہ! میرے نزدیک بانسری کے یہ چھ سوراخ اس کی زندگی کے چھ مدارج ہیں۔ یہ وہ زینے ہیں جن پر چڑھ کر اس کا وجود محض وجود سے معنی تک پہنچتا ہے۔ بانسری میں سوراخ ایک ساتھ نہیں بنتے؛ ایک ایک کر کے بنتے ہیں، جیسے کوئی فرد ایک ایک مرحلہ طے کرتا ہے۔

پہلا سوراخ — خام فطرت

یہ ابتدائی مرحلہ ہے۔ جہاں وہ محض جبلّت ہے۔ اس مقام پر فرد بھوک، خوف، بقا اور لذت کے تابع ہوتا ہے۔ اچھا اور برا اس کے لیے اخلاقی سوال نہیں بلکہ فائدے اور نقصان کا مسئلہ ہوتے ہیں۔ جیسے نرکٹ جب پہلی بار کاٹا جاتا ہے تو وہ صرف لکڑی ہے — نہ ساز، نہ نغمہ۔ بانسری میں یہ پہلا سوراخ سب سے نیچے ہے، کیونکہ یہ جسم کو زمین سے جوڑے رکھتا ہے۔ اگر کوئی اسی مرحلے میں رک جائے تو وہ محض زندہ رہتا ہے، جیتا نہیں۔ آواز تو نکلتی ہے، مگر وہ فطری چیخ ہوتی ہے، نغمہ نہیں۔

"یہ مرحلہ ضروری ہے،" وزیر نے وضاحت کی، کیونکہ بغیر جبلّت کے زندگی ممکن نہیں۔ مگر یہی جبلّت اگر آخری سچ بن جائے تو جسم محض جان دار سے آگے نہیں بڑھ پاتا۔ یہاں سے سفر شروع ہوتا ہے، مگر ٹھہرنا زوال ہے۔

دوسرا سوراخ اندرونی تصادم کی علامت ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب نفس پہلی بار اپنے آپ سے لڑتا ہے۔ خواہش ایک طرف کھینچتی ہے، ضمیر دوسری طرف۔ یہی کشمکش فرد کو بے چین کرتی ہے، مگر یہی بے چینی ترقی کی پہلی علامت بھی ہے۔ بانسری میں یہ سوراخ وہ مقام ہے جہاں سانس پہلی بار رُک رُک کر بہتی ہے۔ یہ مرحلہ دردناک ہے۔ انسان خود سے سوال کرتا ہے، خود پر شک کرتا ہے۔ مگر اگر یہ تصادم نہ ہو تو تبدیلی ممکن نہیں۔ جو کبھی اپنے آپ سے نہیں لڑتا، وہ کبھی خود کو نہیں پاتا۔ یہاں شور بھی ہے، بے آہنگی بھی — مگر یہی بے ترتیبی آگے کی ترتیب کا پیش خیمہ بنتی ہے۔

تیسرا سوراخ نظم کا ہے، ریاضت کا، اخلاقی کوشش کا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں وجود اپنے آپ کو سکھاتا ہے۔ یہاں اصول بنتے ہیں، حدود مقرر ہوتی ہیں۔ وجود کہتا ہے: یہ کروں گا، یہ نہیں کروں گا۔ بانسری میں یہ سوراخ آواز کو ترتیب دیتا ہے، بے قاعدہ سانس کو سُر میں بدلتا ہے۔ یہ مرحلہ سخت ہے، کیونکہ یہاں آزادی کم اور ذمہ داری زیادہ ہوتی ہے۔ مگر یہی ضبط وجود کو شکل دیتا ہے۔ جیسے بانسری بغیر ناپ کے نہیں بن سکتی، ویسے ہی وجود بغیر نظم کے مکمل نہیں ہوتا۔ یہاں سے وجود محض ردعمل نہیں رہتا، بلکہ انتخاب کرنے لگتا ہے۔

چوتھا سوراخ خود شناسی کا ہے۔ یہاں فرد خود کو دیکھنا سیکھتا ہے۔ نہ بطور الزام، نہ بطور فخر — بلکہ بطور حقیقت۔ یہ مرحلہ آئینہ ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں، صلاحیتوں، ارادوں اور خوف کو پہچانتا ہے۔ بانسری میں یہ سوراخ آواز کو گہرائی دیتا ہے۔ یہ آگہی اسے کونرم بھی کرتی ہے اور مضبوط بھی۔ وہ دوسروں کو سمجھنے لگتا ہے، کیونکہ اس نے خود کو سمجھ لیا ہوتا ہے۔ جو خود کو جان لیتا ہے، وہ دنیا سے لڑنا چھوڑ دیتا ہے۔ یہ مرحلہ اس کو اندر کی خاموشی سے آشنا کرتا ہے، جہاں اصل نغمہ جنم لیتا ہے۔

پانچواں سوراخ عشق ہے۔ یہاں وہ حساب چھوڑ دیتا ہے، "وزیر کی آواز میں نرمی آ گئی۔ یہ محبت کسی ایک صورت تک محدود نہیں — یہ پیدا کرنے والے سے، مخلوق سے، سچ سے وابستگی ہے۔ بانسری میں یہ سوراخ آواز کو حرارت دیتا ہے، جان بخشتا ہے۔ یہاں فرد عمل کرتا ہے مگر بدلے کے بغیر۔ اس کی خدمت عبادت بن جاتی ہے، اور اس کی خاموشی دعا۔ محبت کے بغیر آگہی سرد ہے، اور نظم بے جان۔ یہ مرحلہ اسے اپنی ذات سے باہر نکالتا ہے۔

چھٹا سوراخ — سپردگی کا ہے۔ آخری سوراخ سب سے اوپر ہے، سانس کے سب سے قریب۔ یہاں وجود خود کو چھوڑ دیتا ہے۔ یہ سپردگی ہے — فنا۔ یہاں نہ خواہش باقی رہتی ہے، نہ خوف، نہ سوال۔ انسان نغمہ نہیں بناتا، نغمہ اس سے بن جاتا ہے۔ بانسری اس مقام پر خود کو بھول جاتی ہے۔ آواز کسی کی نہیں رہتی۔ یہ وصال ہے — جہاں ساز باقی نہیں رہتا، صرف موسیقی رہ جاتی ہے۔

"جہاں پناہ! بانسری کے چھ سوراخ چھ زخم نہیں، چھ مدارج ہیں۔

وجود جتنا خالی ہوتا جاتا ہے، اتنا ہی بھرتا جاتا ہے — اور آخر کار خود کو کھو کر، سب کچھ پا لیتا ہے۔

نقار خانے میں سکوت تھا، مگر اب یہ سکوت وصال کی دہلیز بن چکا تھا۔

پانچواں وزیر آگے بڑھا تو اس کے چہرے پر فکر کی گہرائی اور نگاہ میں ایک عجب ٹھہراؤ تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اشیا کو ان کے ظاہر سے نہیں، ان کے اثر سے پہچانتے ہیں۔ اس نے بانسری کو یوں دیکھا جیسے وہ کسی آئینے میں کسی اور کو دیکھ رہا ہو، پھر نہایت متانت سے گویا ہوا:

"جہاں پناہ! میں بانسری کے چھ سوراخوں کو چھ ادراکی حواس سمجھتا ہوں۔ انسان جیسا سنتا، دیکھتا، چکھتا اور محسوس کرتا ہے، ویسا ہی بن جاتا ہے۔ بانسری کی آواز بھی انہی سوراخوں کے کھلنے اور بند ہونے سے ترتیب پاتی ہے۔"

پہلا سوراخ — بصارت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ آنکھ ہے۔ مگر صرف آنکھ نہیں — انتخاب کی آنکھ۔ وہ سب کچھ نہیں دیکھتا، وہ

وہی دیکھتا ہے جو دیکھنا چاہتا ہے۔ نظر اگر خواہش کے تابع ہو جائے تو حقیقت مسخ ہو جاتی ہے۔ بانسری میں اگر یہ سوراخ بے قابو رہے تو آواز بھٹک جاتی ہے۔

وزیر نے کہا کہ نگاہ کی تہذیب اس کی پہلی تربیت ہے۔ جو شخص ہر منظر پر نظریں گاڑ دے، اس کے باطن میں شور بڑھ جاتا ہے۔ مگر جب نظر کو سادہ اور محدود کر دیا جائے تو وہ حسن کو پہچاننے لگتی ہے۔

"نگاہ جب پاک ہو تو دنیا بوجھ نہیں رہتی، نشانی بن جاتی ہے۔"

بانسری بھی تبھی صاف آواز دیتی ہے جب یہ پہلا سوراخ حد میں رہے — نہ مکمل بند، نہ بے قابو کھلا۔

دوسرا سوراخ ہے سماعت۔ یہ وہ دروازہ ہے جہاں سے دنیا وجود کے اندر داخل ہوتی ہے۔ وہ ہر بات سنتا ہے، مگر ہر آواز اس کے لیے مفید نہیں۔ غیبت، شور، نفرت — یہ سب سماعت کے راستے دل میں اترتے ہیں۔ بانسری میں اگر یہ سوراخ ہر سانس کو قبول کر لے تو آواز منتشر ہو جاتی ہے۔ جو یہ نہیں جانتا کہ کیا سننا ہے اور کیا چھوڑ دینا ہے، وہ اندر سے بکھر جاتا ہے۔ پاک سماعت خاموشی کو بھی سنتی ہے۔ جیسے بانسری میں ٹھہرا ہوا وقفہ نغمے کا حصہ ہوتا ہے، ویسے ہی انسان میں خاموش سننا کردار کو نکھارتا ہے۔

۔تیسرا سوراخ زبان ہے۔ لفظ بھی آواز ہیں۔ اور ہر آواز نغمہ نہیں ہوتی۔ بانسری کی آواز ناپ تول سے نکلتی ہے، مگر بعض کے لفظ اکثر بے قابو ہوتے ہیں۔ جو کوئی بولنے میں ضبط نہیں رکھتا، اس کا کردار بے وزن ہو جاتا ہے۔ وزیر نے کہا کہ خاموشی بھی ایک سُر ہے۔ جو کوئی کم بولتا ہے مگر درست بولتا ہے، اس کی بات دیر تک گونجتی ہے۔ زبان اگر سُر میں ہو تو شخصیت خود بخود نغمہ بن جاتی ہے۔

چوتھا سوراخ ذائقے کی علامت ہے — نہ صرف کھانے کا، بلکہ پسند اور ناپسند کا۔ ہر کوئی جو چاہتا ہے، وہی بنتا ہے۔ بے قابو خواہش بانسری کی دھن کو بھاری کر دیتی ہے۔ مگر ضبط ذائقے کو نفاست عطا کرتا ہے۔ جو ہر ذائقہ چکھنا چاہتا ہے، وہ کسی ایک کا مزہ نہیں پہچانتا۔ یہ سوراخ سکھاتا ہے کہ خواہش کو مکمل دبانا نہیں، بلکہ تربیت دینا ضروری ہے۔

پانچواں سوراخ لمس ہے۔ یہ سوراخ تعلقات کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہر چھونا وابستگی پیدا کرتا ہے۔ اگر فرد ہر شے سے چمٹ جائے تو آزادی کھو دیتا ہے۔ بانسری میں یہ سوراخ اگر حد سے زیادہ بند ہو تو آواز رک جاتی ہے، اور کھلا رہے تو توازن بگڑ جاتا ہے۔ صحیح لمس وہ ہے جو قریب رکھے، مگر قید نہ کرے۔ یہی تعلق کی حکمت ہے۔

آخری سوراخ ظاہری حواس سے ماورا ہے۔ یہ بصیرت ہے — وہ نگاہ جو آنکھ بند ہونے پر بھی دیکھتی ہے۔ وزیر کی

آواز میں گہرائی آ گئی۔ یہی وہ ادراک ہے جو حق اور باطل میں فرق کرتا ہے۔ جب یہ سوراخ کھلتا ہے تو باقی تمام حواس نظم میں آجاتے ہیں۔ بصیرت کے بغیر علم اندھا ہے، اور عبادت بے سمت۔

جہاں پناہ! بانسری کا نغمہ اس بات پر منحصر ہے کہ کون سا سوراخ کھلا ہے اور کون سا بند۔ کردار بھی اسی توازن سے بنتا ہے۔ جو اپنے حواس کی تربیت کر لیتا ہے، وہ خود ایک زندہ بانسری بن جاتا ہے — جس میں ہر سانس معنی پیدا کرتا ہے۔

جب پانچواں وزیر اپنی بات مکمل کر کے پیچھے ہٹا تو نقارخانے میں ایک عجیب سی حرارت محسوس ہونے لگی۔ گویا الفاظ کے بجائے جذبے بولنے کو بے چین ہوں۔ اسی لمحے چھٹا وزیر آگے بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں آگ کی سی چمک تھی، مگر اس آگ میں جلا دینے کے بجائے روشن کرنے کی طاقت تھی۔

اس نے بانسری کو دیکھا اور کہا:

جہاں پناہ! میں ان چھ سوراخوں کو وجود کے اندر جلنے والی چھ قسم کی آتش سمجھتا ہوں۔ یہ وہ الاؤ ہیں جن سے کوئی فرد خالی نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کچھ کے اندر یہ آگ دھواں بن کر آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے، اور کچھ کے اندر یہی آگ روشنی بن کر راستہ دکھاتی ہے۔ بانسری بھی انہی آگوں کے ضبط سے نغمہ پیدا کرتی ہے۔

پہلا سوراخ — خواہش ہے۔ یہ پہلی آگ ہے۔ اور سب سے قدیم بھی۔ خواہش زندگی کو حرکت دیتی ہے۔ بھوک، محبت، کامیابی، پہچان — سب اسی آگ کی شاخیں ہیں۔ اگر یہ آگ نہ ہو تو جسم مٹی کا پتلا رہ جائے، نہ چلے، نہ چاہے، نہ خواب دیکھے۔

مگر وزیر نے گہری سانس لے کر کہا: جب یہ آگ بے قابو ہو جائے تو روشنی نہیں دیتی، صرف دھواں پیدا کرتی ہے۔ بے لگام خواہش نظر دھندلا دیتی ہے۔ وہ کم کو کم سمجھنے لگتا ہے، اور زیادہ کو بھی ناکافی۔ بانسری میں اگر یہ سوراخ حد سے زیادہ کھلا رہے تو سانس بکھر جاتی ہے، نغمہ قائم نہیں رہتا۔ لیکن جب خواہش سنور جائے، تو یہی آگ قوتِ تخلیق بن جاتی ہے۔ انسان چاہتا ہے، مگر صبر کے ساتھ۔ آگ جلتی ہے، مگر چراغ کی طرح۔ ضبط شدہ خواہش نغمے کی پہلی حرارت ہے،" وزیر نے کہا۔

دوسری آگ غضب کی ہے۔ یہ وہ آگ ہے جو وجود کو کھڑا بھی کرتی ہے اور جلا بھی دیتی ہے۔ غصہ ناانصافی کے خلاف اٹھنے والی چنگاری بھی ہے، اور خود غرضی کا شعلہ بھی۔ جب یہ آگ بے قابو ہو تو زبان زہر بن جاتی ہے، ہاتھ ہتھیار، اور

دل ویران۔ بانسری میں یہ سوراخ اگر بد تہذیب ہو تو آواز کڑوی ہو جاتی ہے، کانوں کو چبھتی ہے۔ مگر جب غضب صاف ہو جائے، تو یہی آگ جرأت، غیرت اور عدل میں بدل جاتی ہے۔ یہ وہ حرارت ہے جو انسان کو باطل کے سامنے خاموش نہیں رہنے دیتی۔ غضب جب سُر میں آ جائے، تو طاقت بن جاتا ہے۔ اور طاقت جب نغمہ بن جائے، تو ظلم رک جاتا ہے۔

تیسری آگ خوف کی ہے — خاموش مگر مسلسل جلتی ہوئی۔ خوفِ نقصان، خوفِ موت، خوفِ تنہائی — یہ سب قدم روک لیتے ہیں۔ اگر یہ آگ غالب آ جائے تو انسان اندر سے راکھ ہو جاتا ہے، مگر باہر سے زندہ نظر آتا ہے۔ بانسری میں اگر یہ سوراخ خوف سے بند رہے تو سانس اندر جا کر رک جاتی ہے، آواز پیدا نہیں ہوتی۔ مگر جب یہی خوف پاک ہو جائے تو احترام بن جاتا ہے — ایک ایسا احترام جو انسان کو حد میں رکھتا ہے۔ یہ خوف جلاتا نہیں بلکہ سنبھال لیتا ہے۔ یہ آگ جب چراغ میں بدل جائے تو سب سے نرم روشنی دیتی ہے۔ اور یہی روشنی نغمے کو وقار بخشتی ہے۔

چوتھی آگ غرور کی ہے۔ یہ سب سے فریب دینے والی آگ ہے۔ کیونکہ یہ روشنی کا دھوکا دیتی ہے۔ غرور یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ خود کافی ہے۔ یہی احساس سب سے بڑا پردہ ہے۔ بانسری میں اگر یہ سوراخ سخت ہو جائے تو سانس ٹکرا کر لوٹ آتی ہے، نغمہ پیدا نہیں ہوتا۔ غرور کی آگ اگر بے قابو ہو تو فرد کو تنہا کر دیتی ہے۔ وہ سب سے بلند تو ہوتا ہے، مگر سب سے الگ۔ مگر جب یہی آگ سنور جائے تو وقار بن جاتی ہے۔ وجود خود کو جانتا ہے، مگر خود کو خدا نہیں سمجھتا۔'' جھکا ہوا شعلہ روشنی دیتا ہے۔ اکڑا ہوا شعلہ سب کچھ جلا دیتا ہے۔

پانچویں آگ امید کی ہے۔ یہ وہ آگ ہے جو اندھیرے میں بھی بجھتی نہیں۔ امید چلنے کی تحریک دیتی ہے۔ لیکن یہ آگ حقیقت سے کٹ جائے تو فریب بن جاتی ہے — ایسی روشنی جو راستہ نہیں، خواب دکھاتی ہے۔ بانسری میں یہ سوراخ اگر غلط جگہ کھل جائے تو آواز میٹھی تو ہوتی ہے، مگر کھوکھلی۔ مگر جب امید صبر اور شعور کے ساتھ جلے تو یہی آگ استقامت بن جاتی ہے۔ جسم ٹوٹتا نہیں، جھکتا نہیں، بلکہ ٹھہر کر چلتا ہے۔'' امید وہ آگ ہے جو نغمے کو تسلسل دیتی ہے۔

آخری آگ عشق کی ہے — سب سے روشن، سب سے پاک۔

وزیر کی آواز مدھم ہو گئی۔ یہ وہ آگ ہے جو جلاتی نہیں، مگر سب کچھ پگھلا دیتی ہے۔ محبت جب خالص ہو تو باقی تمام آگیں نظم میں آ جاتی ہیں۔ خواہش پاک ہو جاتی ہے، غضب عدل بن جاتا ہے، خوف ادب، غرور وقار، اور امید یقین۔ بانسری میں یہ سوراخ سانس کے سب سے قریب ہے، کیونکہ محبت ہی اصل محرک ہے۔ یہاں نغمہ ذاتی نہیں

رہتا، ازلی و ابدی ہو جاتا ہے۔ محبت وہ آگ ہے جو دھواں نہیں بنتی۔'' صرف روشنی اور نغمہ۔

''جہاں پناہ! وجود کے اندر شش آتش جلتی ہیں۔ جو انہیں بے قابو چھوڑ دے، وہ دھوئیں میں گم ہو جاتا ہے۔ اور جو انہیں سُر میں لے آئے وہ خود ایک بانسری بن جاتا ہے— جس میں ہر سانس روشنی بن کر بولتی ہے۔

نقار خانے میں خاموشی چھا گئی۔ مگر یہ خاموشی راکھ کی نہیں تھی— یہ ایک ایسی آگ تھی جو اب نغمہ بننے والی تھی۔

بادشاہ نے وزیروں کی آرا خاموشی، توجہ اور وقار سے سنیں۔ نقار خانے میں اس وقت ایک عجیب سکوت تھا؛ جیسے ہر ساز، ہر دیوار، ہر شمع بادشاہ کے الفاظ کی منتظر ہو۔ پھر بادشاہ آگے بڑھا۔ اس کی آواز میں اقتدار نہیں بلکہ معرفت کی گہرائی تھی۔ اس نے بانسری کو ہاتھ میں لیا، آنکھیں بند کیں اور کہا کہ تم نے چھ سوراخوں کو خواہش، نفس، عقل، محبت، جسم اور آگ کے استعاروں میں دیکھا؛ میں انہیں مقدس صحیفے کی روشنی میں دیکھتا ہوں— کیونکہ اصل نغمہ وہی ہے جو حق کے سُر سے ہم آہنگ ہو۔

پہلا سوراخ ہے نفسِ اَمّارہ۔

یہ سوراخ وجود کی خام ترین سطح ہے، جہاں خواہش حکم دیتی ہے اور عقل خاموش رہتی ہے۔ نفسِ امّارہ وہ اندرونی آواز ہے جو کہتی ہے: ''مجھے چاہیے، ابھی چاہیے، ہر قیمت پر چاہیے۔'' یہی وہ مقام ہے جہاں بانسری کا وجود ٹھوس لکڑی ہوتا ہے— بے سر، بے اثر— کیونکہ ابھی اس میں شگاف نہیں پڑا۔

یہ سوراخ درد سے بنتا ہے۔ آخری صحیفہ اس نفس کو برائی کا حکم دینے والا کہتا ہے، مگر اسے مٹانے کا حکم نہیں دیتا۔ یہ پہلا زخم ہے، پہلی گذرگاہ، جس سے ہوا گزر سکتی ہے۔ اگر یہ سوراخ نہ ہو تو بانسری خاموش رہے گی؛ اگر یہ بے قابو ہو تو چیخ بن جائے گی۔ اسی لیے نفسِ امّارہ کو کاٹنا نہیں، تراشنا ہے— روزہ، ضبط، محاسبہ اسی تراش کے اوزار ہیں۔ یہ سوراخ اگر بیضابطہ کھلا رہے تو نفس ہر سانس کو اپنی بھوک بنالیتا ہے۔ مگر جب یہ سوراخ میزان میں آجائے، جب خواہش عبادت کی حد میں آجائے، تو یہی نفس ایندھن بن جاتا ہے— حرکت، جدوجہد اور حیات کا ایندھن۔

دوسرا سوراخ ہے نفسِ لوّامہ۔

یہاں بادشاہ کی آواز نرم ہوگئی۔ یہ وہ سوراخ ہے جہاں وجود پہلی بار خود سے سوال کرتا ہے۔ یہی ضمیر کی پیدائش ہے۔ نفسِ لوّامہ ملامت کرتا ہے، ٹوکتا ہے، آئینہ دکھاتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں فرد اپنی آواز سننے لگتا ہے— اور اکثر اسے ناگوار پاتا ہے۔

یہ سوراخ پہلے سے زیادہ گہرا ہے، کیونکہ یہ صرف خواہش نہیں کاٹتا، بلکہ غرور کو بھی چھیدتا ہے۔اس مقام پر وہ دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ایک جو گناہ کرتا ہے، دوسرا جو شرمندہ ہوتا ہے۔یہی کشمکش سُر پیدا کرتی ہے۔اگر یہ سوراخ نہ ہوتو وجود محض جان دار سے آگے نہیں بڑھتا۔اگر یہ حد سے بڑھ جائے تو مایوسی پیدا کرتا ہے۔صوفیا نے کہا ہے کہ نفسِ لوّامہ رحمت ہے— کیونکہ ندامت ہی توبہ کا دروازہ ہے۔بانسری کا یہ سوراخ آواز کو کانپ دیتا ہے؛ یہی کپکپاہٹ دلوں کو چھوتی ہے۔

تیسرا سوراخ ہے نفسِ مُلہمہ۔یہ وہ مقام ہے جہاں فرد کو پہلی بار خیر اور شر کا ذوق ملتا ہے۔یہ سوراخ الہام کا ہے—اندر کی سرگوشی کا۔اب نفس صرف ملامت نہیں کرتا، بلکہ راہ بھی دکھاتا ہے۔یہ وہ سطح ہے جہاں دل میں اچانک نیکی کا خیال اُبھرتا ہے، بغیر کسی دلیل کے۔یہ سوراخ بانسری کے وسط میں ہے—توازن کی جگہ۔یہاں سے نکلنے والی آواز واضح ہوتی ہے، مگر ابھی مکمل نہیں۔انسان اب اچھائی کو پہچاننے لگا ہے، مگر اس پر قائم رہنا ابھی باقی ہے۔

یہاں عقل اور دل پہلی بار ہاتھ ملاتے ہیں۔یہ سوراخ اگر بند ہو جائے تو فرد خشک عالم بن جاتا ہے؛ اگر بے قابو ہو تو وہم کا شکار۔الہام کو شریعت کی سان پر پرکھنا اسی مقام کی ذمہ داری ہے۔

چوتھا سوراخ نفسِ مُطمئنّہ ہے۔

یہاں بادشاہ کی آواز میں سکون اتر آیا۔یہ وہ سوراخ ہے جہاں شور ختم ہو جاتا ہے۔خواہش خاموش، ضمیر مطمئن، الہام واضح۔نفسِ مطمئنہ وہ کیفیت ہے جہاں فرد اپنے پیدا کرنے والے سے راضی اور رب اس سے راضی ہو جاتا ہے۔یہ سوراخ بانسری کو گہرائی دیتا ہے۔یہاں سے نکلنے والی آواز میں اضطراب نہیں، ٹھہراؤ ہوتا ہے۔یہ وہ نغمہ ہے جو دل کو تھام لیتا ہے، کیونکہ اس میں شک نہیں۔

یہاں فرد دنیا میں رہ کر دنیا کا نہیں رہتا۔دکھ آتے ہیں مگر توڑتے نہیں۔خوشی ملتی ہے مگر بہکاتی نہیں۔یہ مقام عبادت کا نہیں، عبدیت کا ہے۔

پانچواں سوراخ ہے روح۔

بادشاہ نے بانسری کو دل کے قریب رکھا۔یہ سوراخ نفس کا نہیں، روح کا ہے۔یہ محض کوشش سے نہیں بنتا، یہ عطا ہے۔یہاں سانس صرف ہوا نہیں رہتی، امر بن جاتی ہے۔یہاں عقل خاموش ہو جاتی ہے، زبان گنگ، اور دل فقط حاضر۔یہ وہ مقام ہے جہاں نغمہ سننے والا اور نغمہ پیدا کرنے والا ایک ہو جاتے ہیں۔روح وہ راز ہے جو بیان نہیں، بس جیا جاتا

ہے۔بانسری کے اس سوراخ سے **نکلنے** والی آواز کو سننے کے لیے کان نہیں، قلب چاہیے۔

آخر میں **بادشاہ** خاموش ہو **گیا**۔ پھر بولا۔

چھٹا سوراخ **سریت** ہے۔

یہ سوراخ نہ دکھائی دیتا ہے، نہ ناپا جا سکتا ہے۔ یہ وہ راز ہے جہاں ''میں'' ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں نہ **نفس** ہے، نہ عقل، نہ حتیٰ کہ روح کا احساس — بس حق۔ یہی وہ مقام ہے جہاں **بانسری** خود نہیں بجاتی، بلکہ بجائی جاتی ہے۔ یہی فنا ہے، یہی بقا۔

بادشاہ نے **بانسری** رکھ دی۔**نقار** خانے میں خاموشی تھی، **مگر** وہ خاموشی بھی **ایک نغمہ** تھی۔